لہٗ دعوۃ الحق

قرآن وسنّت کی تعلیمات کا علمبردار

جلد نمبر ۴ — ذی قعدہ ۱۳۸۸ھ
شمارہ نمبر ۵ — فروری ۱۹۶۹ء

مدیر
سمیع الحق

اس شمارے میں

بدلِ اشتراک

مغربی پاکستان :- سالانہ چھ روپے، فی پرچہ ۶۰ پیسے۔
مشرقی پاکستان :- سالانہ بذریعہ ہوائی ڈاک آٹھ روپے، فی پرچہ ۷۵ پیسے
غیر ممالک :- سالانہ ایک پونڈ

سمیع الحق استاد دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک طابع وناشر نے منظور عام پریس پشاور سے چھپوا کر دفتر الحق دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقش آغاز

زینت آرائے مسند درس حدیث، سرخیل علماء حق، پیکر سنت، ترجمان حدیث شیخ الحدیث بقیۃ السلف مولانا نصیر الدین صاحب غورغشتوی قدس اللہ سرہ العزیز تقریباً ۹۳ برس کی عمر میں ملت مسلمہ کو داغ جدائی دے گئے۔ ۴ ذی قعدہ ۱۳۸۸ھ مطابق ۲۳ جنوری ۱۹۶۹ء کی صبح پونے سات بجے جب کہ آفتاب عالمتاب طلوع ہو رہا تھا واہ کینٹ کے فوجی ہسپتال میں علمی اور معنوی دنیا کا یہ روشن آفتاب غروب ہوگیا، دوسرے دن جمعہ کو جبکہ عالم رنگ و بو کا آفتاب مغربی افق پر ڈھلنے والا تھا تو ملک کے طول و عرض سے پروانہ وار جمع ہونے والے حضرت کے لاتعداد معتقدین اور تلامذہ نے علم و عمل، زہد و اخلاص، فقر و قناعت، تقویٰ و للھیت کا یہ معنوی آفتاب آغوش لحد کے سپرد کر دیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون، نماز جنازہ حضرت کے بڑے صاحبزادہ نے پڑھائی، اور اندازہ لگانے والوں کے نزدیک شرکاء جنازہ کی تعداد ایک لاکھ سے متجاوز تھی جس نے العزۃ للہ ولرسولہ وللمومنین کا سماں باندھ دیا ـــــ روح مبارک شوق لقاء میں عرصہ سے مضطرب اور بے قرار تھی اگر کسی نے درازی عمر کی دعا کی تو فرمایا کہ اب تو عافیت اور سلامتی ایمان کی دعا چاہیے ـــ پچھلے دو چار سالوں سے حج و زیارت کے پردہ مجاز میں تسکین ڈھونڈھ رہے تھے۔ اس سال قرعۂ فال سب سے پہلے اسی دیوانۂ عشق حقیقی کے نام کا نکلا، رخت سفر باندھنے کی تیاری ہونے لگی جس ذات قدسی صفات علیہ السلام کے اقوال و فرمودات کی اشاعت میں عمر بھر مصروف رہے، اب جب اس کی چوکھٹ کی جبہ سائی کا مژدہ آپہنچا تو فرحت و اشتیاق کا کیا عالم ہوگا ـــ؟ ملنے والے دعا لینے اور الوداع کہنے حاضر ہونے لگے ـــ ادھر سمیع و بصیر محبوب حقیقی رب کریم اپنے ایک عاشق زار بندہ کے سوز و جذب اور شوق و ولولہ سے بخوبی آگاہ تھا، اپنے بندہ کی ناتوانی اور جسمانی ضعف اور کمزوری اس کی نگاہ میں تھی، اس کے علم میں تھا کہ پیمانۂ شوق اب لبریز ہو چکا ہے، اور خاکی قالب کو لا فانی احساسات اور ولولوں کا مزید تحمل نہیں کہ یکایک آغوش رحمت وا ہوئی اور حج و زیارت

میں مستور مجازی وصال کی نعمت ابدی اور حقیقی وصال کی دولت سے بدل گئی اور بیت اللہ سے پہلے رب البیت تک پہنچ گئے۔ یا ایتہا النفس المطمئنۃ ارجعی الی ربک راضیۃ مرضیۃ فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی - حضرت کی زندگی اس قحط الرجال میں ایک مثالی زندگی تھی، علم کے ساتھ تواضع، سادگی، خلوص، استغناء، درد دین اور احیاء سنت کا جذبہ بیکراں اس زندگی کے نمایاں خدوخال ہیں۔ اس دور کے بعد شاید ہی ایسے بے لوث اور سراپا اخلاص وعمل بزرگ مل سکیں گے۔ نصف صدی سے زیادہ عرصہ تک ایک بوسیدہ مسجد کی چھت اور کبھی درختوں کی چھاؤں میں زمین کے فرش پر بیٹھ کر تشنگان حدیث رسولؐ کو علوم نبویہ سے سیراب کرتے رہے۔ تلامذہ کا حلقہ پاک وہند کے علاوہ افغانستان بلکہ پورے وسط ایشیا تک وسیع ہے تعداد آٹھ دس ہزار کے لگ بھگ تو ضرور ہوگی، پھر یہ ساری خدمت خالص رضائے مولیٰ کی خاطر، نہ عہدہ نہ منصب نہ تنخواہ نہ کوئی وظیفہ اور نہ کوئی ادارہ بلکہ وہ خود اپنی ذات سے ایک انجمن تھے، بڑے بڑے اداروں کے منصب تدریس وصدارت کی پیشکش بھی اس مجسمہ توکل کی آبروئے فقر وقناعت پر اثر انداز نہ ہو سکی، پوری زندگی قرون اولیٰ کے محدثین کا نمونہ تھی۔ اور جس طرح ہندوستان کی سرزمین میں شاہ ولی اللہ مرحوم نے حدیث نبویؐ کی قندیل روشن کی اسی طرح شمالی مغربی سرحدی علاقے اور وسط ایشیا کے بلاد میں جو علمی زوال وانحطاط کا شکار ہو چکے تھے حدیث کا غلغلہ حضرت مرحوم کی ذات سے ہوا۔ پھر صرف مسند تدریس کی رونق قائم نہیں رکھی، بلکہ میدان تصنیف میں ایک ممتاز شارح اور مصنف حدیث ہونے کا ثبوت مشکوٰۃ شریف کی فاضلانہ شرح کی شکل میں دیا۔ ارشاد وتزکیۂ باطن میں ایک نامور شیخ کا مقام پایا، اس کے ساتھ ساتھ دین حق پر جب بھی کوئی نازک وقت آیا اور دین کی متاع مقدس پر زیغ والحاد نے دست اندازی کرنا چاہی یا دینی اقدار میں رخنہ ڈالنا چاہا تو حمیت دینی سے سرشار بڑھاپے اور بیماری کے احساس سے بے نیاز شیخ اعلاء حق کیلئے میدان میں کود پڑے، تحریک ختم نبوت کی تاریخ اس عمر رسیدہ محدث کی قربانی اور جذبۂ جہاد کو فراموش نہ کر سکے گی۔ ولی اللّٰہی خانوادہ اور قاسمیؒ ومحمودیؒ قافلہ، علم وعمل اور دعوت وعزیمت کے اس فرزند جلیل پر بجا طور پر نازاں رہے گی ــــ چودھویں صدی ختم ہو رہی ہے، اکابر واسلاف کا سلسلۃ الذہب (سنہری زنجیر) ٹوٹ رہا ہے۔ دو ایک کڑیاں رہ گئی تھیں وہ بھی بکھرنے لگیں، مگر فتنوں کا زور بڑھ رہا ہے۔ آثار قیامت نمایاں ہیں اگر آنے والی نسلوں کا رشتہ اپنے

زرّیں ماضی سے بالکل کٹ گیا، اور بیچ کی کوئی کڑی بھی باقی نہ رہی تو یہ یقیناً قیامت کے آثار میں نمایاں اور واضح نشانی ہوگی یہ بزرگ آئے اور زندگی کے روشن مینار فتنوں کے اندھیروں میں جلاکر چلے گئے، اب ان ہی خطوط پر چلنا ہے۔ ہم ایک ایسے دور میں داخل ہونے والے ہیں، جس میں زہد، اخلاص، علم وعمل، توکل وقناعت اتباعِ سنت اور دین کی دردمندی کی ایسی بے لوث اور جامع مثالیں عنقا ہوں گی، علم وعمل جیسی روحانی چیزوں کو مادیت کے حقیر ترازو سے تولا جائے گا، اگر دین کے حاملین اور علم نبوت کے نام لیواؤں نے اپنے ان اسلاف کی زندگی سے سبق نہ سیکھا تو خودغرضی، لالچ خوف اور طمع حبِ جاہ ومال میں ڈوبی ہوئی "عالمانہ زندگی" سے بھٹکنے والوں کی رہنمائی نہ ہو سکے گی یہ علم کا زوال ہوگا جسے قیامِ قیامۃ کا پیش خیمہ کہا گیا ہے ـــــــ وہ دیکھئے ملاء اعلیٰ میں امام ابوحنیفہؒ اور احمد بن حنبلؒ کی محفل اور شیخ احمد سرہندیؒ، ولی اللہ الدہلویؒ، محمد قاسم نانوتویؒ، شیخ الہند محمود الحسنؒ اور حسین احمد مدنیؒ، احمد علی لاہوریؒ کے جلو میں نصیر الدینؒ غورغشتوی بھی پہنچ گئے ہیں، اور سب مل کر ہمیں دعوتِ عمل دے رہے ہیں کہ وراثتِ نبوت کے دعویدارو اور تاجدارِ ختمِ نبوت کے نام لیواؤ اگر تم ہماری جیسی ابدی زندگی اور درجاتِ قربِ خداوندی چاہتے ہو تو اپنی زندگی کی ہر متاع کو حفاظتِ دین پر نثار کردو، اپنی ہر حرکت وعمل اور ہر بات میں رحمۃ للعالمینؐ کی زندگی کا مجسم نمونہ بن جاؤ کہ وقت نازک سے نازک تر ہوتا جارہا ہے، اور ذمہ داری تمہاری سخت سے سخت تر ہوتی جارہی ہے ـــــــ ان قدسیوں کا پیغام بس یہی ہے کہ تمہارا جینا اور مرنا صرف اور صرف اسلام کیلئے ہونا چاہئے، تم اگر سوچو تو اسی معیار پر، بولو تو اسی پیمانے اور کرو تو وہی جو ہم نے کر دکھایا۔ یہی فوز وفلاح ہے، یہی سرخروئی اور یہی تمہارے منصب کا تقاضا ـــــ کاش! شیخ الحدیث غورغشتیؒ کے تازہ داغِ مفارقت سے ہمارے زخم ہرے ہوجائیں ـــــ جذباتِ تحفظِ دین اور مدافعتِ اسلام کے احساسات تیز تر ہوں تو جانے والے کی بارگاہ میں یہی ہمارا بہترین خراجِ تحسین ہوگا۔ اللھم اعظم اجرہٗ ولاتحرمنا بعدہٗ وارزقہ الجنۃ

★

اوائل جنوری میں ہفتہ عشرہ کیلئے ڈھاکہ جانا ہوا، سیاسی پارٹیوں کے ساتھ بنیادی حقوق کے حصول اور احیاءِ جمہوریت کے سلسلہ میں جمعیۃ العلماء اسلام کا فیصلہ قوم کے سامنے آچکا

ہے جو کانفرنس میں اکابرِ جمعیۃ کے بہترین تدبّر، اور کئی دن کے غور و خوض کا نتیجہ ہے۔ یہ اشتراک صرف منفی پہلو پر تھا مگر الحمد للہ کہ پھر بھی تمام اکابر جمعیۃ بالخصوص جمعیۃ کے مدبّر اور باشعور قائد مولانا مفتی محمود صاحب نے ڈھاکہ کی عمومی اور خصوصی میٹنگوں میں نہایت دو ٹوک اور واضح انداز میں بار بار تمام پارٹیوں کو یہ چیز ذہن نشین کرائی کہ جمعیۃ العلماء کا مقصود و مطلوب اوّل و آخر اسلام ہے جو دنیا و آخرت اور معاش و معاد سب کا جامع ترین نظامِ ہدایت ہے۔ اور یہ کہ جمعیۃ کا اصل نشانہ کفر والحاد اور لادینی ہے۔ اصل تصادم نظریات سے ہے اور اشخاص سے توافق یا تقابل تو حصولِ مقصود کا ایک ذریعہ ہے آج اگر حزبِ اقتدار دینی اقتدار کی بحالی میں سنگِ گراں بنی ہے اور جمعیۃ کا فرضِ منصبی ہے کہ اُسے راہ سے ہٹا دے تو کل یہی جدوجہد اور جوشِ عمل، تنظیم اور قوت حزبِ اختلاف کے ان عناصر کی سرکوبی میں بھی پیش پیش ہوگا، جو مسندِ اقتدار پر پہنچ کر اسلام کے نام پر حاصل کی گئی مملکت سے غداری کر کے اسلام اور اسلامی اقتدار سے گریز کرنا چاہیں گے ____ جن لوگوں کی نظریں موجودہ دور کی لادینی مغربیت پر ہیں یا دورِ عصر حاضر کے غیر فطری معاشی ازموں کو اپنا کعبہ مقصود بنا چکے ہیں، انہیں یاد رکھنا چاہیئے کہ جمعیۃ العلماء اسلام بلکہ علماءِ حق کا ہر فرد زندگی کی آخری رمق تک ان کے خواب کو ہرگز شرمندۂ تعبیر نہ ہونے دیگا، اگر جمعیۃ نے بعض ایسی پارٹیوں کے لادینی عزائم کو بھانپ کر بھی موجودہ حالات میں اشتراک کر لیا ہے تو یہ صرف اس لئے کہ اسلام کے نام پر لٹے پٹے مسلمانانِ پاکستان کو اپنی "لیلائے مقصود" سے وصال کا موقع مل سکے جو صرف اور صرف اسلام ہے۔ اور یہ فیصلہ عوام کی عدالت میں تبھی ہو سکتا ہے کہ انہیں فیصلہ کرنے کا حق اور موقع مل جائے، ہمیں یقین ہے کہ عوام کا یہ فیصلہ نہ تو کیپٹل ازم کے بارہ میں ہوگا، اور نہ سوشلزم یا کمیونزم کے حق میں بلکہ صرف خالص دینِ فطرت اسلام کے بارہ میں ہوگا۔

ڈھاکہ میں جمعیۃ العلماء مشرقی پاکستان نے ایک کھلے اجلاس کی شکل میں اپنی وسعت ہمہ گیری اور قوت کا مظاہرہ بھی کیا جو وہاں کے علماءِ حق کو حالات کی نزاکت اور تنظیم کی ضرورت محسوس ہو جانے کے لحاظ سے لائقِ صد تحسین ہے، اس ناچیز کا تاثر ملک کے اُس حصّہ کے بارہ میں یہی ہے کہ دین سے محبت اور والہانہ تعلق کے لحاظ سے وہاں کے باشندے بہت

آگئے ہیں، آئے دن اس کی مثالیں سننے اور دیکھنے میں آتی رہتی ہیں۔ اس کا ایک ادنیٰ نمونہ ڈھاکہ کے قریب ٹونگی میں ہونے والے تبلیغی جماعت کے اجتماع کی شکل میں بھی میرے سامنے آیا کہ ۵، ۶ لاکھ مسلمانوں کا مجمع ایک ویرانے میں گھر بار چھوڑ کر جمع ہے اور ان کا اوڑھنا بچھونا صرف اور صرف دین کی دل سوزی اور فکر مندی ہے، یہ ایک مثالی اجتماع تھا، اس کے مقابلہ میں لادینی عناصر کی قوت بہت کم ہے، مگر پھر بھی سیاست کی ترجمانی کرنے والے کلّی یا جزوی طور پر دین سے بہت دور ہیں اور میدان خالی ہونے کی وجہ سے سیاست پر لادینی عناصر کا غلبہ ہے اور خدا اور تصورِ آخرت سے باغی کرنے والے لٹریچر کو فروغ کا موقع بھی مل رہا ہے۔ پس اس مہلک مرض کا اگر کوئی علاج ہے تو یہی کہ وہاں کے علماء حق زیادہ سے زیادہ جوشِ عمل، اخلاص تنظیم اور قوتِ ایمانی سے میدان میں کود پڑیں، سادہ دل اور مخلص عوام کو دین کی اخلاقی اور معاشی قدروں سے روشناس کرائیں اور دین کی جامعیت اور اعتدال کے مقابلہ میں موجودہ خالص مادی نظاموں کی بے اعتدالی اور بے مائگی ثابت کر دیں، انہیں زندگی کی صحیح کامیابی کا راستہ دکھائیں اس کے لئے مستحکم تنظیم، سیاسی تدبّر کے ساتھ ساتھ عصر حاضر کے لادینی نظاموں سے پوری واقفیت اور گہری نظر بھی ضروری ہے۔ اگر علماء حق نے اس نہج پر کام کو تیز تر کر دیا تو سیاسی قیادت خود بخود دیندار طبقہ کے ہاتھ آجائے گی اور اس کا رخ بے دینی کی طرف نہیں موڑا جاسکے گا۔ وہاں کی سرزمین علماء حق کے لحاظ سے بہت زرخیز ہے، پھر جس مٹی کی سیرابی بطل اسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ جیسے سراپا دعوت وعزیمت بزرگوں کے ہاتھوں سے ہوئی ہو اگر وہاں بھی علماء جمود اور تعطل کا شکار ہوئے اور قیادت لادینی نظریات کے علمبردار سیاستدانوں کے ہاتھ میں گئی تو یہ نہ صرف ان علماء کے حق میں بلکہ وہاں کے لئے دینی سیاسی معاشی اور اخلاقی و ملکی لحاظ سے بھی بدترین المیہ ثابت ہوگا۔

واللہ یقول الحق وھو یھدی السبیل

سمیع الحق
۲۳ ذی قعدہ ۱۳۸۸ھ (فروری ۶۹ء)

انٹرویو

قسط ۲

ضبط و ترتیب : سمیع الحق

علامہ قاری محمد طیب صاحب قاسمی

سے

ایک ملاقات

★

حضرت قاسم العلوم کی سراپا نور زندگی کے اہم گوشوں پر روشنی ڈالنے کے بعد اب اگلا سوال خود حضرت حکیم الاسلام کی زندگی کے بارہ میں تھا، اور ڈرتے ڈرتے حضرت سے کچھ اپنی زندگی کے بارہ میں ارشاد فرمانے کی جرأت کی گئی۔

حضرت مسکرا کر فرمانے لگے: میری زندگی کیا جو میں بیان کروں۔ ہاں ایک تو پیدائش کا قصہ ہے جو مجھے یاد آیا اور جسے اپنے بڑوں سے میں نے سنا۔ وہ یہ کہ میرے والد صاحب (مولانا حافظ محمد احمد مرحوم) کی پہلی بیوی سے کوئی اولاد نہ تھی، جو شادی خود حضرت نانوتوی نے کرائی تھی۔ تو سارے بزرگوں بالخصوص حضرت شیخ الہند کی یہ تمنا تھی کہ حضرت نانوتوی کی نسل چلے تو دوسری شادی دیوبند میں کرائی، اس سے میرے تین بھائی مجھ سے پہلے پیدا ہوئے، لیکن وہ کمسنی میں پیدا ہوتے ہی مر گئے۔ تو حضرت شیخ الہند کو بڑی تڑپ تھی کہ کوئی زندگی کی اولاد ہو تو فتح پور ہسوہ میں ایک بزرگ تھے جو اولاد کے بارہ میں مستجاب الدعوات مشہور تھے۔ تو حضرت مولانا عبد السمیع صاحب کو حضرت شیخ الہند نے بھیجا کہ وہاں جا کر دعا کراؤ کہ مولانا حافظ احمد صاحب صاحب اولاد ہو وہ سفر کر کے گئے، جا کر عرض کیا کہ شیخ الہند کا بھیجا ہوا ہوں، اور یہ درخواست ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ رات بیچ میں ہے کل صبح اس کا جواب دوں گا۔ مولانا ان کے مکان میں ٹھہر گئے۔ صبح کو آئے اور خوش ہوئے۔ فرمایا

کہ میں نے دعا کی اور جب تک منظور نہ کرائی سجدے سے سر نہیں اٹھایا، اور مجھے وعدہ دیا گیا کہ حافظ صاحب کا لڑکا ہوگا جو حافظ اور قاری بھی ہوگا، مولوی بھی ہوگا، اور حاجی بھی ہوگا ــــ

ــــ مجھے یہ واقعہ اس وقت معلوم ہوا جب پہلا حج ہوا میں جا رہا تھا تو طلبہ اساتذہ سب اسٹیشن گئے۔ اس تانگے میں مولانا عبدالسمیع صاحب تھے اور میں تھا۔ مولاناؒ نے کہا کہ بھئی میں تجھے ایک واقعہ سنانا چاہتا ہوں۔ اور یہ واقعہ سناتے ہوئے فرمایا کہ جب تو حافظ قرآن ہوگیا تو میں نے کہا ایک جز تو الحمد للہ قبول ہوگیا۔ پھر تو نے قرأت کی تکمیل کی تو میں نے کہا دوسرا جز پورا ہوا پھر تو نے فراغت تحصیل کی تکمیل کی تو میں نے کہا الحمد للہ اس بزرگ کے کشف کا تیسرا جز بھی مکمل ہوا۔ آج تو حج کو جا رہا ہے تو فرمایا کہ خدا کا شکر ہے چوتھا جز بھی پورا ہو رہا ہے۔

آگے چل کر حضرت قاری صاحب نے فرمایا ــــ میری پیدائش کے بعد کان میں اذان دینے کیلئے حضرت حاجی محمد عابد صاحب کو بلایا گیا جو اکابر دیوبند اور شیوخ میں سے تھے۔ اس وقت حیات تھے اور میری عمر کے آٹھ نو برس تک حیات تھے، ان کی صورت مجھے یاد ہے۔ اور میں خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا۔ انہوں نے کان میں اذان دی ــــ حضرت حافظ محمد ضامن شہیدؒ کے صاحبزادے حافظ محمد یوسف صاحب بھی اکابر بزرگوں میں سے تھے۔ وہ دیوبند تشریف لائے۔ اس وقت میری عمر مہینہ ڈیڑھ مہینہ تھی تو میری دادی صاحبہ مرحومہ نے مجھے ان کے پاس بھیجا کہ اس کے لئے دعا کریں۔ انہوں نے ہاتھ میں لے کر کہا کہ اسے میں لے چکا ہوں، دعا کیا کروں۔؟ قبول کر چکا ہوں۔ اب اللہ جانے اس کا کیا مطلب تھا۔ ظاہری صورت تو یہ پیش آئی کہ میری شادی رامپور میں ان کے خاندان میں ہوئی۔ ان کی عزیزہ میرے گھر میں آئی، ممکن ہے یہ مطلب ہو یا اور کوئی ــــ اس کے بعد جب مجھے الف با تا پڑھنے کے لئے بٹھلایا گیا، تو بہت بڑا جلسہ دارالعلوم میں منعقد کیا گیا، دور دور سے مہمان آئے تو مولانا ذوالفقار علی صاحب حضرت شیخ الہندؒ کے والد نے بسم اللہ کرائی، اور مولانا شبیر احمد عثمانی مرحوم کے والد مولانا فضل الرحمٰن صاحب نے ایک قصیدہ پڑھا تو بہت بڑے شاعر تھے اس قصیدہ کا مجھے ایک مطلع یاد رہا، اور ایک مقطع۔ مطلع تو یہ تھا ؎

تہنیتاً مکتب طیب کی مبارک تقریب
کچھ عجب طرح کا جلسہ کچھ عجب طرح کی سیر

اور مقطع یہ تھا جو تاریخ کو بھی سمیٹے تھا ؎

رب یسر جو کہا اس نے تو بے روئے ادب
فضل تاریخ میں بول اٹھا کہ "تمم بالخیر"

تو بہر حال ان اکابر کے توجہات تھے، میں نے اپنی زندگی ایسی گذاری جیسے شہزادے گذارتے ہیں۔ ہر طرف حضرت نانوتویؒ کے نام لیوا بڑے بڑے اکابر، حضرت شیخ الہند وغیرہ حضرات بس اسطرح ناز برداری کرتے تھے جیسے کوئی بادشاہ زادہ ہو، اب بھی جو یہ حضرات کچھ لحاظ پاس کرتے ہیں، غلط فہمی میں نہیں کہ میرے اندر کوئی قابلیت ہے۔ اصل میں نسبت ہے ان بزرگوں کی جس کی وجہ سے یہ سارا اکرام ہے۔

یہاں تک حضرت کہہ گئے تھے کہ رفیق مجلس قاری سعید الرحمان صاحب (راولپنڈی) نے ایک تلخ موضوع چھیڑ دیا۔ "مسلمانوں کے تنزل کے اسباب" ایک ایسا موضوع جس پر بحث و فکر تو مدتوں سے ہو رہی ہے مگر مرض کا علاج صرف نایاب اور بیش قیمت نسخوں کے معلوم کرنے سے کب ہو سکتا ہے جب تک مرض کے ازالہ کے لئے عملی قدم نہ اٹھایا جائے۔ آج مسلمانوں کے تنزل کے اسباب و محرکات پر بلا مبالغہ ضخیم سے ضخیم کتابیں لکھی گئی ہیں۔ مسلمانوں کی کوئی اہم دینی یا سماجی تقریب ان اسباب پر زور بیان صرف کرنے سے خالی نہیں جاتی۔ منبر و محراب کو لیجئے یا میدان صحافت و انشاء وہ کونسا انداز ہے جو مسلمانوں کے جگانے اور مرض کی تلافی کرنے کیلئے اختیار نہیں ہو رہا۔ مگر جمود اور تعطل کی تہیں جمتی ہی جا رہی ہیں اور اب جب سقوط بیت المقدس کے واقعہ ہائلہ اور قیامت صغریٰ نے ہماری خواب غفلت کو نہ جھنجوڑا تو شاید صور اسرافیل ہی ہم غفلت شعاروں کو بیدار کر سکے ۔۔۔ مگر ہائے وہ بیداری جو سوائے افسوس اور کف ندامت ملنے کے کسی کام کی ثابت نہ ہو سکے۔

۔۔۔۔۔ یہی تصویر حضرت قاری صاحب مدظلہ کے سامنے آچکی ہو گی کہ جب انہوں نے سوال سنا تو ایک دلگداز سانس بھر کر خود ہی سوال دہرایا "مسلمانوں کے تنزل کے اسباب۔؟" اور پھر اہل سیاست پر ایک بھرپور نشتر چبھوتے ہوئے فرمایا کہ: اس میں تو سیاسی لوگوں کی رائے معتبر ہے، ایک ملّا نے کی رائے کیا معتبر ہو گی ۔۔۔ وہ سیاست جو مسلمانوں کے عروج و زوال کے خدائی قوانین سے بے خبر ہو کر بھی صرف مادیت کے گھمنڈ میں تاریخ کے ہر واقعہ پر رائے زنی اپنا ہی حق سمجھتی ہے۔ حضرت قاری صاحب کے اس مختصر سے جملہ میں واقعی اس سیاست پر یہ ایک بھرپور وار تھا ۔۔۔ تنزل کے اسباب کا ذکر شروع کرتے ہوئے قاری صاحب نے اصول اور کلیات پر گفتگو کی بجائے اپنے معاشرہ کے چند جزئیات سے اس پر روشنی ڈالنا چاہی ایک صاحب بصیرت شخصیت اور صاحب نظر کا یہی کام ہے کہ علمی

اور نظری چیزوں کی بجائے وہ جزئیات اور عملی مثالیں سامنے رکھ دے جن سے نظریات اور کلیات تشکیل پذیر ہوتے ہیں، مگر انسانی فہم ہمیشہ عملی مثال اور نمونوں ہی سے زیادہ اثر پذیر ہوتا ہے۔ تنزل کے اسباب سے بحث کرتے ہوئے حضرت نے نہ تو فلسفیانہ موشگافیوں کی آڑ میں پناہ لینا چاہی، اور نہ پیچیدہ عقلی اور نظری طول طویل محرکات کی فہرست مرتب فرمائی بلکہ موجودہ معاشرہ کی ایک ایسی دھندلی سی تصویر نگاہوں میں رکھ دی، جس کے ساتھ ہم سب اپنا موازنہ کرسکیں اور پھر خود ہی سوچیں کہ اس سارے تنزل اور بربادی کے ذمہ دار اگر ہم خود نہیں تو اور کون ہے۔؟ افسوس ان لوگوں کی بے بصیرتی پر جن کی نظر اسباب تنزل سے بحث کرتے ہوئے موجودہ مسلم معاشرہ کی بے اعتدالیوں پر تو نہیں جاتی، مگر رہ سہہ کر ان کی ساری غور و فکر یورپی تہذیب اور مغرب کے سسکتے ہوئے فلسفۂ حیات کے گرد گھومنے لگتی ہے۔ حضرت حکیم الاسلام نے تنزل کے اسباب بیان کرتے ہوئے فرمایا ـــــ کہ ابھی دو تین برس کا واقعہ ہے، میرٹھ کے ہندو کمشنر تھے، سالانہ دارالعلوم آئے اور بہت متاثر ہوئے، یہ جنگ ستمبر شروع ہونے سے ایک مہینہ پہلے کی بات ہے، انہوں نے مجھ سے کہا کہ مولانا ملک کے حالات بہت نازک اور خراب ہیں، میں نے کہا جی ہاں اخبارات سے تو ہم بھی یہی محسوس کرتے ہیں کہا کوئی سبب بھی ہے اس پستی اور پریشانی کا، میں نے کہا ہاں سبب ہے، کہا کیا سبب ہے؟ میں نے کہا بالکل غیر ضروری ہے اس کا بتلانا اس واسطے کہ میں ہوں ایک مذہبی آدمی، تو ہر حادثے کو مذہب کے نقطۂ نگاہ سے سوچتا ہوں۔ آپ ہیں سیاسی اور برسر اقتدار انسان آپ ہر چیز کو سیاسی نقطۂ نظر سے سوچتے ہیں۔ تو میرا نقطۂ نظر آپ پر اثر انداز نہیں ہوگا۔ اس لئے بتانا غیر ضروری ہے۔ اس نے اصرار کیا کہ کچھ تو کہئے گا، اور میرا منشا بھی یہی تھا کہ یہ زور دے تو بتاؤں ـــــ تو میں نے کہا سنی لیجئے میرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ دنیا کی کوئی قوم کبھی بھی ترقی نہیں کرسکتی نہ دولت سے چاہے ارب پتی بن جائے، اور نہ کوئی قوم عادی اکثریت سے ترقی کرسکتی ہے کہ افراد اس کے پاس زیادہ ہوں اور نہ کوئی قوم محض سیاسی جوڑ توڑ سے ترقی کرسکتی ہے، دنیا کی اقوام کردار اور اخلاق سے ترقی کرتی ہیں۔ تو اس وقت ہمارے ملک کی اخلاقی گراوٹ انتہاء کو پہنچ چکی ہے۔ اس لئے حالات نازک نہ ہوں گے تو کیا ہوگا۔ کہنے لگے بالکل صحیح بات ہے لیکن یہ تو ایک اصول بیان کیا آپ نے، اسکی مثال بھی ہے، میں نے کہا مثال کے طور پہ پہلی بات یہ کہ آج سے چالیس پچاس برس پہلے جب ایک ہندو عورت

باہر پھرتی تھی تو گز بھر کا گھونگھٹ اس کے منہ پر ہوتا اور حیا کی وجہ سے بچتی ہوئی چلتی۔ اس وقت عورت نہ صرف یہ کہ گھونگھٹ سے باہر ہے بلکہ لباس سے بھی۔ اور اس سے بھی ایک قدم بڑھ کر آپے سے باہر ہو گئی ہے۔ سوچتا ہوں کہ ایسی عورتوں کے کوکھ سے جو اولاد پیدا ہو، کیا اس میں کوئی حیا اور شرم و غیرت ہو گی، دوسری بات یہ ہے کہ ریلوں میں ہمیں سفر کرنے کی نوبت آتی ہے۔ تو سکولوں اور کالجوں کے نوجوان لڑکے کسی ڈبہ میں اگر آجاتے ہیں تو ہمیں یہ فرق کرنا مشکل ہوتا ہے کہ یہ آدمی ہے یا جانور۔ اس قدر بیہودہ اور رکیک حرکتیں کرتے ہیں کہ کوئی بھلا آدمی نہ کر سکے۔ اگر ان لوگوں کے کندھے پر ملک کا بار آگیا تو سوائے بد اخلاقی کے یہ اور کیا پھیلائیں گے ــــــ

تیسری چیز یہ ہے کہ ریلوں میں سفر کرتے دیکھا کہ جہاں کہیں شوگر ملز آیا، گاڑیاں گنوں سے بھری کھڑی ہیں، سو پچاس مسافر اترے کسی نے سو گنے کسی نے دو سو گنے کسی نے پچاس کسی نے گٹھڑی باندھ لی اور قطعاً انہیں احساس نہیں کہ یہ چیز ہماری ہے یا غیر کی۔ تو اگر ملک کا بار ان کندھوں پر آیا تو سوائے لوٹ گھسوٹ کے یہ کیا کریں گے ــــــ

چوتھی بات یہ ہے کہ تاجروں کا طبقہ ہے اور تجارت پر ملک کا دار و مدار ہے۔ اس طبقہ میں بلیک الگ ہے، نفع خوری الگ ہے۔ ذخیرہ اندوزی الگ۔ تو جب تاجروں میں خیانت آجائے تو ملک کی برقراری کیسے ہو سکتی ہے ــــــ

پانچویں بات یہ ہے کہ جب حکام کو دیکھا جائے تو رشوت ستانی، جانب داری، اقربا پروری، یہ ایک عام چیز بن گئی ہے، اور رشوت تو ایسا ہے جیسا حق ہو گیا۔ تو جب حکام میں خیانت آجائے تو بھلا وہ ملک کیسے برقرار رہے گا۔ میں نے کہا یہ حالات ہیں۔ کہنے لگا بالکل بجا ہے۔ تو میں نے کہا کہ پھر گورنمنٹ کا سب سے پہلا فرض یہ ہے کہ اپنے ملک کی اخلاقی حالت درست کرے۔ آپ دولت اور بیرونی کرنسی جمع کرنے کی فکر میں رہتے ہیں۔ لیکن اسکی فکر کسی کو نہیں، کہنے لگا کہ یہ ناممکن ہے کہ اخلاقی حالت درست ہو سکے۔ میں نے کہا کیوں۔؟ کہا حکومت یہ نہیں چاہے گی، کیونکہ اخلاق درست ہوتے ہیں مذہبی تعلیم سے، اور حکومت سیکولر یعنی لامذہب ہے۔ وہ آ نہیں سکتی بیچ میں۔ تو میں نے کہا کہ میرے اور آپ کے نقطۂ نظر میں یہاں سے فرق ہو گیا۔ آپ کے نزدیک سیکولر کا معنی لامذہبیت ہے اور میرے نزدیک سیکولر کا معنی ہمہ مذہبی حکومت ہے کہ ہر مذہب حکمران ہو۔ اور

گورنمنٹ کا فرض ہے کہ ہر طبقے کو مجبور کرے کہ وہ اپنی مذہبی تعلیم پائے تاکہ اس کا اخلاق صحیح ہو۔ کہنے لگے یہ ہو نہیں سکتا۔ میں نے کہا آپ خود چاہتے ہیں کہ اس ملک میں چور اور ڈاکو پیدا ہوں۔ کہنے لگا آپ جو چاہیں مطلب نکالدیں، باقی یہ ہوگا نہیں۔ میں نے کہا ایک تدبیر میں بتلا دوں، کہا کیا؟ میں نے کہا ملک ہمارے سپرد کر دیجئے، سب حالات درست کر دیں گے۔ اس پر وہ بہت ہنسا۔ تو بہرحال ملک اور قوم کی ترقی ہوتی ہے، اخلاق و کردار سے، جب یہ ختم ہو جائے تو سب سے بڑا تنزل کا سبب یہی ہے ـــــــ

راقم السطور نے کہا حضرت ہمارے تنزل میں مغربیت کا بھی حصہ ہے۔؟ فرمایا اس سے بھی وہی بات نکلتی ہے کہ مغربی اخلاق اختیار کئے جائیں، اسلامی اخلاق چھوڑ دیں، تعلیم مغربی غالب ہو اور دینی تعلیم مغلوب، دینی افراد مغلوب ہوں اور بے دین افراد غالب ہوں بنیاد سب کی ایک ہی ہے کہ مذہب سے رشتہ توڑ دو۔ اب اس کے بعد اصلاح کے کیا صورت ہو؟ تو حضرت نے اپنے تجربہ اور بصیرت کی بناء پر فرمایا کہ آپ حضرات بحمداللہ مذہب کی خدمت کر رہے ہیں، اور خدا کا شکر ہے کہ لاکھوں کروڑوں آدمی جو اس لپیٹ میں آگئے ان کا دین درست ہو رہا ہے۔ لیکن برسر اقتدار طبقہ بالکل دوسرے رنگ میں ہے مگر اس میں بھی میری ایک رائے ہے کہ کسی سے تقابل کی ٹھان کر کسی کی اصلاح نہیں ہو سکتی آپ چاہیں تو ایجی ٹیشن کریں یا مقابل بن کر اصلاح کرنا چاہیں، یہ ہو نہیں سکتا، اس کی صورت تو یہ ہے کہ مستغنیانہ طریق سے ان لوگوں کے دلوں میں کچھ چیزیں ڈالی جائیں اور اپنا غرض مطلب کچھ نہ رکھا جائے، نہ عہدہ نہ دولت، بلکہ انہیں آپ یقین دلادیں کہ اقتدار تمہارا رہے گا اور ہم بھی اس کے ساتھ تعاون کریں گے۔ ہم اقتدار نہیں چاہتے۔ مگر اتنی بات کرو اور ایسا کرنا ملک اور قوم دونوں کے لئے نافع، ورنہ اس سے ملک اور قوم اور تمہارے اقتدار سب کو خطرہ ہے۔ اس انداز سے کام کرنا چاہئے، سیاسی رنگ کے لوگ سیاسی انداز سے اور دینی رنگ کے لوگ دینی انداز سے جب تک خواص کو متوجہ نہیں کریں گے کام نہیں چلے گا۔ اب عوام کیطرف توجہ کی جاتی ہے اور ایجی ٹیشن کی صورت اختیار ہو۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اشتعال میں آجائے حکومت، تو وہ بھی پھر چڑ پڑ آتی ہے، تو نہ صرف یہ کہ وہ آپ کی نہیں مانے گی بلکہ گرانے کی کوشش کریگی۔ تو اصلاحی رنگ میں چند افراد اپنی زندگی اس مقصد کیلئے وقف کردیں اور جو اوپر کا طبقہ ہے ان میں رسوخ حاصل کر کے اس کے کانوں میں باتیں ڈالی جائیں اور اس انداز سے کہ فلاں بات تیرے مفاد کے خلاف ہے۔

حضرت! پاکستان کے علماء کے لئے کوئی مخصوص پیغام ۔ ؟

"پیغام کا مجھے حق بھی نہیں۔ غیر ملک کا آدمی پیغام کیا دے ۔ مگر یہ میں نے صبح کی مجلس میں بھی تفصیل سے عرض کیا تھا کہ جو مفکر قسم کے چند علماء ہیں اور با اثر بھی ہیں وہ ایک یادداشت کے طور پر کچھ بنیادی چیزیں حکومت کو پیش کریں اور اس پر یہ ظاہر کر دیں کہ ہم آپ کی حکومت کو اپنی حکومت سمجھتے ہیں۔ ہمارا پورا تعاون رہے گا۔ تقویت اور نصرت کریں گے ۔ مگر اتنی چیز ہے کہ دین کے لئے اور ملک کے بقاء کی خاطر فلاں فلاں کام کرو۔ اگر یہ نہیں ہوگا تو ملک و قوم میں خرابی ہوگی اور آپ کی بنیاد بھی اسی سے قائم ہے ـــ اس یادداشت اور ملاقاتوں میں جزئیات کو پہلے نہ چھیڑا جائے ، بلکہ اصولی اور کلی رنگ میں یہ لوگ کچھ مانوس ہو جائیں، پھر آہستہ آہستہ جزئیات سود وغیرہ جیسے مسائل کان میں ڈال دیئے جائیں۔ مگر پہلے ارباب اقتدار کے ذہن کو اصول میں لے آیا جائے ـــ میں تو واقعی اگر یہاں کا باشندہ ہوتا اور باریابی کا موقع مل جاتا تو صدر ایوب سے کہتا کہ مجھے آپ اپنا خادم اور خیر خواہ سمجھیں مگر دو باتیں ہیں، ایک تو یہ کہ تعلیم قرآن اور دینی علوم کو عام قرار دیں۔ اور یہ کام مستند علماء سے کرلیجئے ۔ ہر اس عالم کو عالم نہ سمجھیں جو علم کا لبادہ پہن کر آئے ، اور علم اس کا محض مطالعہ یا اخبار بینی کا ہو ، نہ اس کے پاس سند ہو نہ استناد نہ بزرگوں کے پاس رہ کر اس نے علم حاصل کیا ہو۔ ایسے علماء کو اختیار کر کے ان سے ہر کام میں مشورہ نہ کریں۔ ہر مدعی علم کو عالم نہ سمجھیں بلکہ اسکی تلاش کر کے کام کریں۔

کوئی طبیب بھی اگر ہوتا ہے تو یہی نہیں کہ مریض ہر کس و ناکس کے ہاتھ میں جا کر ہاتھ دے دے گا۔ اور نبض دکھلا دے گا۔ بلکہ وہ پہلے ڈھونڈھتا ہے کہ طبیب طبیہ کالج کا فارغ ہے یا کہاں کا ؟ اس کا بورڈ یا سند دیکھتے ہیں۔ اس کے پاس آنے والے مریضوں کی اکثریت کو دیکھتے ہیں کہ شفایاب ہو کر جاتے ہیں یا نہیں۔ تو جان بچانے کے لئے تو آپ انتخاب کریں۔ تو ایمان بچانے کے لئے کیا ضروری نہیں ہے کہ صالحین روحانی اطباء صحیح علماء کا انتخاب کیا جائے۔

اور دوسری بات ان سے یہ عرض کرتا کہ آپ معروفات کو یکدم جاری نہیں کرتے تو نہ سہی مگر کم از کم منکرات کا راستہ تو بند کر دیں۔ اس سے اخلاق میں خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ مقدم چیز ہے دفع مضرت اور جلب منفعت مؤخر ہے اور دفع مضرت میں یہ ہے کہ کم از کم پہلے وہ منکرات تو ختم کر دیں جو عقلی منکرات ہیں۔ اور دنیا کی ہر قوم اسے برا سمجھتی ہے، اس کے بعد منکرات شرعیہ کو لیں۔ جب اس سے فارغ ہوں تو معروفات شرعیہ کو لیں مگر کم از کم منکرات تو ختم کر دیں اور یہ بھی

تدریجاً سہی رفتہ رفتہ اس لئے کہ آپ کی مجبوریاں ہیں، آپ کے روابط اور مراسم سیاسی ان اقوام سے ہیں کہ ان کے ہاں یہ منکرات جزو تمدن ہیں تو اگر یکدم آپ کامیاب نہ ہوں تو راستہ تو منکرات مٹانے کا ڈال دیں ـــــ دوسری چیز یہ عرض کرتا کہ خلفاء راشدین یا سلاطین عادل جو گنے چنے ہیں ان کے علاوہ عامۃ وہی سلاطین ہیں جنہیں اپنی اقتدار کی فکر ہے، لیکن تاریخ یہ بتلاتی ہے کہ جس بادشاہ کے ساتھ کوئی عالم ربانی لگ گیا اسکی حکومت نہایت اعلیٰ گذری، حالانکہ وہ عالم عہدہ دار نہیں تھا ـــــ ہارون الرشید کے ساتھ امام ابویوسف لگے ہوئے تھے ـــــ اورنگ زیب عالمگیر علماء سے مشورہ لیتا رہا ـــــ مولانا شبیر احمد عثمانی کے بارہ میں مرحوم نوابزادہ لیاقت علی خان نے مجھ سے کہا کہ جب ہم کسی مسئلہ میں الجھ جاتے ہیں تو مولانا عثمانی سے روشنی حاصل کرتے ہیں۔

تو جب آپ اسلام کے نام پر حکومت کر رہے ہیں اور ملک اسلام کا ہے تو اسلام کے حاملین سے کب صرف نظر کیا جا سکتا ہے ہاتھ جو قدم اٹھائیں تو کم ازکم دو چار علماء کی بات تو سن لیا کریں، آپ انہیں نہ جاگیر دیں، نہ عہدہ، نہ وہ طلب کریں گے ـــــ"

حضرت حکیم الاسلام اصلاح احوال کی تجویز پر اپنی بصیرت اور فراست ایمانی کی روشنی میں گفتگو فرما رہے تھے، اور میں سوچ رہا تھا کہ اگر عصر حاضر کی اسلامی قیادت مصطفیٰ کمال کے نقش قدم پر اسلام کو فرسودہ اور زمانہ کے تقاضوں سے ہم آہنگ نہ ہونے کا عقیدہ دل و دماغ میں راسخ کر چکی ہو۔ دین کی ترجمانی کے لئے کسی صلاحیت اور استحقاق کو اجارہ داری سمجھا جا رہا ہو اور جب رعایا کی اکثریت بھی اعجاب رائی (اپنی رائے اور گھمنڈ پر غرور) میں مبتلا ہو چکی ہو۔ پھر جب خوشامدی، خود غرض اور لالچی قسم کے علماء نے حکام کے ساتھ روابط کو رعیت کی نگاہ میں دین فروشی کے ہم معنی سمجھ لیا ہو۔ اور خالص مصلحانہ کوششوں پر بھی سیاست کا رنگ چڑھ گیا ہو تو حکام اور اہل دین کے درمیان خلیج دور ہونے کے لئے اور دینی اقدار کی خاطر اس خلاء کو پاٹنے میں حضرت قاری صاحب مدظلہ کی یہ خیر خواہانہ تجویز کس حد تک مفید ثابت ہو سکتی ہے ـ ؟ اس راہ کی مشکلات کو ایک خاص رخ سے پیش کرتے ہوئے میں نے عرض کیا: حضرت! جب حکام سمجھ بیٹھے ہوں کہ اسلام عصر حاضر کے ساتھ چل ہی نہیں سکتا تو انہیں حاملین اسلام کی اہمیت اور ضرورت کا احساس ہو جانا کب ممکن ہے ـ ؟

حضرت نے فرمایا: ان کی یہ غلط فہمی دور کر دینی چاہیئے کہ موجودہ دور کی ترقیات میں اسلام حارج ہے۔

بلکہ ان کے دل میں ڈال دینا چاہئے کہ زمانہ کی کوئی چیز بھی جو کسی درجہ میں واقعی صحیح اور کارآمد ہو، اسلام اس کا مخالف نہیں۔ مگر وہ منکرات جو دنیا کی ہر قوم میں منکرات عقلی ہیں، زناکاری، جوا، سود، شراب نوشی قسم کی چیزیں جسکی قباحت مسلمات عقلیہ میں سے ہے۔ ان چیزوں کو ترقی کا معیار بناکر اسے اسلام کے ساتھ نہیں جوڑا جا سکتا، البتہ جو چیزیں منکر نہیں ہیں، اور اخلاق و معاشرت پر اثر انداز نہیں ہوتیں، اسلام کبھی بھی اسکی مخالفت نہیں کرتا۔ سیاسی اور ملکی تدابیر میں ہمیشہ توسع سے کام لیا گیا ہے۔ اور جو اجتہادی امور ہیں اسکی اسلام میں گنجائش ہے اور ان کی اچھائی برائی کو جانچنے کے لئے ایسے لوگوں کو مشیر بنائیں جنہیں فقہ اور شریعت پر عبور ہو ـــ پھر قاری صاحب نے فرمایا: مقصد اصلاح حال ہے اور یہ کہ حالات سدھر جائیں اخلاص اور جذبۂ خیر خواہی کے ساتھ ایسا راستہ اختیار کیا جائے جو ایک دوسرے کو دور کرنے کی بجائے نزدیک کر دے ـــ

ـــ رات ڈھل رہی تھی، وقت تیزی کے ساتھ دل و دماغ پر اپنے حسین نقوش ثبت کرتے ہوئے گذر رہا تھا۔ ایسے نقوش جو مجلس میں چلنے والے ٹیپ ریکارڈر کے فیتہ پر ثبت ہونے والے ارتعاشی اور صوتی حرکات سے کہیں زیادہ پائدار اور دیرپا تھے۔ وقت بجائے خود ایک ایسی ریکارڈنگ مشین ہے جو ایک ایسے نامۂ اعمال کے اوراق میں سب کچھ محفوظ کر رہی ہے جسکی پنہائیوں اور گہرائیوں پر "الساعۃ" اور زلزلۃ الساعۃ کی ہلاکت انگیزیاں بھی اثر انداز نہ ہو سکیں گی۔ اور جب کرتا دھرتا سب کچھ مجسّم بن کر سامنے آجائے گا تو پکارنے والا پکار اٹھے گا: مالھذ الکتٰب لایغادر صغیرۃً ولا کبیرۃً الا احصاھا۔

ایسی صحبتیں کب بار بار نصیب ہوتی ہیں۔ حضرت کو مزید تکلیف دینا دل و دماغ پر کتنا ہی گراں گذر رہا تھا، مگر بے اختیار جی چاہا کہ اس مجلس سعید میں کچھ ذکر الحق اور دارالعلوم حقانیہ کا بھی آجائے۔ اور پوچھ بیٹھا کہ الحق کے لئے کونسا طریقۂ کار پسندیدہ ہے ـــ؟ فرمایا: وہی پالیسی جو میں نے عرض کر دی۔ توافق سے کام چلے گا، تقابل سے نہیں، تعمیری انداز میں اصلاح کی سعی تقابل کے انداز سے آپ کی باتیں کسی مخالف پر اثر انداز نہیں ہو سکیں گی۔"

حضرت! جب الحاد اور بے دینی بالکل غالب ہو چکی ہے، پھر کیسی موافقت ـــ؟

برجستہ فرمایا: اسی کی اصلاح کیلئے تو توافق کی ضرورت ہے اور یہ توافق الحاد اور بے دینی سے نہیں ہوگا۔ ان افراد سے توافق ہوگا تاکہ ان لوگوں کو الحاد سے ہٹا دیا جائے ـــ

حضرت! کچھ لوگوں پر تو مایوسی کی فضا چھاگئی ہے۔ اصلاح کے مساعی بارآور معلوم نہیں ہو رہے ___؟ حضرت قاری صاحب مدظلہٗ نے فرمایا: کام کیلئے اوّلین شرط یہ ہے، کہ مایوس نہ ہوجائیے آپ تو ورثۂ انبیاء ہیں۔ انبیاء کبھی مایوس نہ ہوئے۔ جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ مجھے اس قوم کو عذاب دینا ہے، جب حضرت نوحؑ نے بددعا کی کہ کسی کافر کو بھی زندہ نہ چھوڑ ورنہ ___ ساڑھے نوسو برس تک نصیحت فرماتے رہے۔ تو مایوسی کی کوئی وجہ نہیں ___

دیگر بلاد اسلامیہ تو دہریت مغربیت اور بے دینی کی لپیٹ میں آہی گئے اور مغلوب ہوگئے تو ایسے حالات میں اہل دین کب تک شکستہ خاطر نہ ہوں گے ___؟ حضرت نے جواب دیا کہ ایسی چیزوں کو تو ملک کے سامنے بطور نظیر پیش کیا جانا چاہئے کہ آج بلاد اسلامیہ باوجود قوت کے تباہ ہو رہے ہیں، اس لئے کہ انہوں نے اسلامی اخوت اور مسلمانوں کے عام اتحاد کو خیرباد کہہ دیا۔ وطنیت کو آگے رکھا۔ اسلامیت کو پیچھے رکھا تو اتنی نظیروں کے ہوتے ہوئے بھی تمہاری آنکھ نہ کھلے تو تباہی سے کیسے بچ سکو گے ___؟

حضرت! قوم اور ملک کی اصلاح تو ارباب عزیمت اور اولوالعزم لوگوں کا کام ہے۔ ہم جیسے عامیوں کے لئے بھی کچھ ارشاد ہو ___ فرمایا: حضورؐ نے ورثہ چھوڑا ہے کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ کا۔ فرمایا تم جب تک انہیں پکڑے رہوگے ہرگز گمراہ نہ ہوسکو گے۔

ترکت فیکم الثقلین لن تضلوا بعدی ابداً ان تمسکتم بھما۔

حضرت! اس مدرسہ دارالعلوم حقانیہ کے بارہ میں کوئی نصیحت۔

فرمایا: آپ لوگ اختیار کئے ہوئے ہیں، بحمد اللہ مدرسہ چل رہا ہے۔ غالب ہو رہا ہے۔ مولانا موجود ہیں، ہر وقت قال اللہ اور قال الرسول ہے۔ اس سے زیادہ کیا روحانیت اور معنویت ہوگی، خدا نے مدرسہ کو ایسے بزرگ اور اساتذہ دیئے ہیں جو بحمد اللہ دین مجسّم ہیں۔

حضرت! مادرِ علمی دارالعلوم دیوبند کی رفتار ترقی کیا ہے۔ اور بجٹ ___؟

فرمایا: انقلاب کے وقت سوا لاکھ تھا، اور اب ساڑھے دس لاکھ ہے۔ انقلاب کے بعد کچھ فکر بھی تھا کہ کیسے چلے گا، مگر اللہ نے بڑھایا اور تمام شعبے بڑھتے ہی گئے۔ پہلے آٹھ شعبے تھے اب ۲۴ شعبے ہیں۔ اسی طرح پہلے اساتذہ ۳۸ تھے، اب ستر کے قریب ہیں۔ اسی طرح عمارات دگنی تگنی ہوگئی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا کرم ہے، طلبہ ڈیڑھ ہزار کے قریب ہیں۔

آخری سوال تھا کہ حضرت نئی پود سے مستقبل میں دارالعلوم دیوبند کے لئے کیسی توقعات

ہیں ——؟ فرمایا: اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہیں ۔ مگر اس میں شک نہیں کہ اس دور کی سب سے بڑی مشکل قحط الرجال کی ہے۔ مگر ہمیں توقع ہے کہ اسلاف کے نقش قدم پر چلنے والے نئی پود میں بھی ہیں، چاہے گنے چنے ہی ہوں مگر اب بھی ایسے لوگ پائے جاتے ہیں —— دوران گفتگو ایک دفعہ حضرت نے موجودہ زمانہ کی سیاست پر بھی اپنی رائے ظاہر کی اور کہا کہ میرا تجربہ یہ ہے کہ اس زمانہ کی سیاست اور دین میں بیر ہے، اس سیاست اور ڈپلومیسی کا بنیادی پتھر ہے نفاق گندم نما جو فروشی۔ اس میں دین باقی نہیں رہ سکتا وہ تو صرف اسلامی سیاست ہے جو دین کے ساتھ چلتی ہے، اور وہ تو جوہر ہے اسلام کا۔ اور ایک ہے عصری سیاست، یہ بالکل تقابل پر ہے دین کے —— جو چیزیں دین میں حرام ہیں اس کے ہاں واجب ہیں، جو یہاں محمود ہیں وہ وہاں مذموم۔ اور صرف یہ میرا مقولہ نہیں بلکہ مولانا اصغر حسین صاحب مرحوم نے بھی یہی الفاظ ارشاد فرمائے کہ —— "مولوی صاحب آج کی سیاست اور دیانت میں بیر ہے۔"
—— اب رات کا ایک بج چکا تھا اور بادل ناخواستہ اس پر لطف محفل کی بساط لپیٹنی ہی پڑی ——۔

سے جمع خواطر میں چونکہ مدد مل جاتی ہے اس لئے مقصود میں کامیابی زیادہ ہوتی ہے۔

۷۔ ایک مجلس میں فرمایا: توبہ صرف ترک عصیان کا نام نہیں بلکہ ترک من خشیۃ اللہ کا نام توبہ ہے۔ (مثلاً ایک شخص شراب اس لئے چھوڑ دیتا ہے کہ اس میں جسمانی ہلاکت ہے خشیۃ اللہ کو اس میں دخل نہ ہو تو نہ اس کو توبہ کہیں گے اور نہ توبہ کے اثرات اور برکات محو ذنب وغیرہ اس پر مرتب ہوں گے۔)

۸۔ ایک دفعہ فرمایا: واردات یعنی حالات وکیفیات حالت انبساط ومسرت میں محسوس ہوتے ہیں، حالت غم وپریشانی میں ان کا ورود نہیں ہوتا۔

۹۔ ایک دفعہ فرمایا: شغل اس وقت کرنا چاہئے کہ نہ بھوک ہو اور نہ زیادہ کھایا گیا ہو۔

۱۰۔ فرمایا: ایک دن حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب گنج مراد آبادیؒ کو بہت فرشتوں کا اترنا محسوس ہوا، پتہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ اسی دن حضرت مولانا عبدالحی صاحب لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ کا وصال ہوا تھا، فرمایا اسی وجہ سے یہ فرشتے اترے تھے۔

ضبط و ترتیب : ادارہ الحق

فضیلتِ علم

مقصد کی بلندی اور اس کے تقاضے

یہ خطاب ۲۳ شوال ۱۳۸۸ھ کو دارالعلوم حقانیہ کے تعلیمی سال کی افتتاحی تقریب میں طلباء اور اساتذہ کے مجمع سے کیا گیا

★

حق تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس پُرفتن دور میں آپ کو یہاں حصول علم کے لئے جمع ہونے کی توفیق ہوئی۔ ہم اور آپ ایک عظیم مقصد کے لئے جمع ہوئے ہیں۔ دنیا میں ہر شخص کا ایک مقصد ہوتا ہے، کسی کا مال و دولت، کسی کا حکومت و سلطنت۔ مگر ان لوگوں کا یہ مقصد تمہارے مقصد کے سامنے ہیچ ہے اگر ایک فرد یا جماعت کی سعی بار آور ہو بھی جائے اور ساری زمین کی حکومت اس کے ہاتھ آجائے مگر اسکی پوزیشن اور مقام زیادہ سے زیادہ امریکہ کے صدر نکسن یا روس کے صدر کے برابر ہو جائے گا، اور یہ مرتبہ یا منصب چند دن رہے گا۔ اگر ایک شخص کروڑپتی بنا تو قارون اور نمرود و شداد کے مقام پر فائز ہوا۔ اس کے مقصد کا مقام صرف یہی ہے مگر آپ لوگ جس مقصد کیلئے نکلے ہیں، اگر اللہ تعالیٰ نے یہ پورا کر دیا اور آپ کامیاب ہو گئے تو یہ مقصد و مقام اتنا بلند ہے کہ حسب ارشاد نبوی العلماء ورثۃ الانبیاء (علماء انبیاء کے وارث ہیں) گویا وراثت نبوی کا مقام آپ کو حاصل ہوا، اس کے مقابلہ میں دنیا کی صدارت اور وزارت کیا چیز ہے۔؟ صدر کرسی پر بیٹھا ہے اور لوگ اسے گالیاں دیتے ہیں۔ مگر عالم کا مقام کیا ہے۔؟ انبیاء کرام نے اپنی وراثت

علم چھوڑا ہے۔ انبیاء کا خصوصی شان اور کمال ہے، اللہ سے بلا واسطہ یا بواسطۂ جبرئیل کے علم حاصل کرکے دنیا تک پہنچانا ہے، تو ایک عالم کا مقام وراثت نبوی کا ہے۔ پھر علم سے صرف آخرت نہیں ملتی بلکہ دنیا کی عزت وجاہت اور بھلائی بھی علم ہی سے ہے۔ دنیا کی بقاء علم سے ہے حضرت آدم کو خدا نے اسماء کی تعلیم دی پھر اس فضیلت کی وجہ سے اسے اپنی خلافت عطا فرمائی فرشتوں نے ان کی تعظیم کی۔ یہ خلافت ربانی کا منصب جلیلہ صرف فضیلت علم کی وجہ سے انسان کو نصیب ہوا ہے۔ عبادت کرنے والے تو آسمانوں میں بہت تھے، فرشتے بیشمار موجود تھے، مگر علم کا مقام اتنا اونچا تھا، کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے فرمایا: انی اعلم مالا تعلمون۔ (بیشک میں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے) مجھے علم ہے کہ میں نے آدمؑ کو کیوں خلافت دی۔

حضرت ابراہیم ادہم ایک بادشاہ گذرے ہیں، انہوں نے اللہ کی رضا کی تلاش کی خاطر بادشاہت چھوڑ دی۔ بڑے ولی گذرے ہیں عجیب حالات ہیں ان کے۔ وہ فرماتے ہیں کہ رحلت علم (علم کے لئے سفر جاری رہنے) کی وجہ سے زمین پر آفات اور بلیات نازل نہیں ہوتے رحلت کا مقصد حدیث نبوی اور قرآن کریم کی خاطر لوگوں کا ایک مقام سے دوسری جگہ کا سفر کرنا ہے۔ جیسے تم لوگوں نے مختلف دیار اور دور دراز مقامات سے یہاں تک کا سفر کیا۔ حدیث کی کتابوں میں پڑھو گے کہ ایک صحابی حضرت ابو ایوب انصاریؓ نے جو دس سال تک حضورؐ کی خدمت میں رہے ایک حدیث کی خاطر اونٹنی خریدی اور دوسرے صحابیؓ کے پاس چالیس دن کا سفر کرکے پہنچے اور ایک حدیث: اللہ فی عون العبد ما دام العبد فی عون اخیہ۔ سن کر واپس ہوئے۔

حج کے موقعہ پر دور دراز سے لوگ علو سند کی خاطر مکہ معظمہ آتے کہ جس شیخ سے حدیث پہنچی ہے اگر وہ حج کرنے آئے ہوں تو ان سے براہ راست سن لی جائے اور بیچ سے راویوں کے واسطے کٹ جائیں، یہ ان لوگوں کا شوق اور تڑپ اور علم کا جذبہ ہے جو صحابہؓ کرام ہیں اگر سیکنڈ بھی حضور اقدس کی زیارت حالت اسلام میں ہو اور اسلام پر خاتمہ ہو جائے تو اس صحابی کا مقام تمام اولیاء سے بلند ہے، وہ بدو صحابی جو دور سے میدان عرفات میں کھڑا حضور اقدسؐ کے دیدار کر رہا ہے، اس کا مقام تمام اولیاء تمام اقطاب اور ابدال سے اونچا ہے ـــــ تو ابو ایوب انصاریؓ جو دس سال تک حضورؐ سے

فیض پاتے رہے مگر اس زمانہ کا مشقتوں کا سفر مصر تک صرف ایک حدیث کیلئے اختیار کیا۔ اور حضرت جابرؓ جو بزرگ صحابی ہیں ایک حدیث کیلئے دمشق کا سفر کرتے ہیں تو ابراہیم ادہم اسی رحلت کو آفات سے بچاؤ کا ذریعہ قرار دیتے ہیں تو علم دین حاصل کرنے والوں کی برکت سے اور مخلوق سے عذاب اٹھ جاتا ہے اور انسان وارث انبیاء بن جاتا ہے اور حضورؐ کا یہ ارشاد: العلماء ورثۃ الانبیاء ۔۔۔ بھی منجملہ جوامع الکلم کے ہے کہ مقام اور ذمہ داریوں کا سارا نقشہ اس میں سمٹ آیا ہے، کہ جب علماء حضورؐ کے وارث کہلائے تو انہیں حضور اقدس کی پوری زندگی ملحوظ رکھنی ہوگی۔ تب اس اونچے مقام پر فائز ہونے کے مستحق ہو سکیں گے۔ اگر دنیا کے معمولی منصب کیلئے جو آخرت کے مقابلہ میں ہیچ ہے۔ انسان عزت اولاد مال اور جان کی قربانی دے سکتا ہے، اور اکثر باغی یا غدار کہلا کر پھانسی بھی ہو جاتا ہے، اور مقصود نہیں کر پاتا، طلب جاہ و منصب میں جان بھی دے دیتا ہے۔ تختہ دار پر چڑھتا ہے جیل جاتا ہے، جبکہ مقصد بھی حقیر اور کامیابی بھی موہوم ہے، مگر پھر بھی قربانی اور جدوجہد میں لگے رہتے ہیں کہ وان لیس للانسان الا ما سعی۔ (نہیں ملے گا۔ انسان کو مگر وہی جس کی کوشش کی) اور خدا اس پر قادر بھی ہے کہ بلا اسباب مقاصد تک پہنچا دے، وہ قادر مطلق ہے۔ مگر اسباب کا سلسلہ چلایا جو عین حکمت کا تقاضا تھا۔ اولاد خدا بلا وسائل دے سکتا تھا۔ مگر نکاح اور توالد و تناسل کا سلسلہ لازمی قرار دیا اور ایسا نہ کرنا حکمت کے خلاف تھا کہ اس کی شفقت اور شان رحیمانہ ہی اسباب کی مقتضی ہے۔ تو علماء کو بلا جدوجہد اور تیاری کے اتنا عظیم منصب کب مل سکتا ہے یہ اہل دنیا دکاندار، تاجر، ڈرائیور اور ہوٹلوں کے ملازم دن رات کام میں مصروف رہتے ہیں، جن کا کاروبار جتنا زیادہ چلتا ہے اتنا ہی وہ آرام و راحت قربان کرتا جاتا ہے رات بارہ بجے سو کر صبح چار بجے پھر ڈیوٹی پر لگ جاتے ہیں کہ ان کے سامنے ایک مقصد ہے دنیا حاصل کرنا تب کامیاب بھی ہوتے ہیں۔ ایک زمیندار سردی اور گرمی میں ہل جوتتا ہے۔ رات بھر کھیت کو پانی دیتا ہے مگر مقصد میں لگن کی وجہ سے مشقت محسوس نہیں کرتا۔ تو جب مقصد اتنا اہم اور عظیم ہو اور پھر جس میں کامیابی بھی غالب ہو سو میں سے کوئی ایک ناکام ہوتا ہے۔ اور پھر اکثریت کے ساتھ کامیابی کا وعدہ بھی ہو کہ اگر دین کے لئے کوئی قدم اٹھاؤ گے تو خدا کی مدد ضرور شامل ہو گی۔ والذین جاھدو افینا لنھدینھم سبلنا: (جن لوگوں نے ہماری راہ میں کوشش کی ہم ان پر ہدایت کے راستے کھول

دیں گے) اور ان تنصروا اللہ ینصرکم۔ (اگر تم نے اللہ کی مدد کی وہ تمہاری مدد کرے گا۔) تو اگر علم کی راہ میں بڑی سی بڑی تکلیف بھی آجائے تب بھی وہ تکالیف اہل دنیا کی مشقتوں کے سامنے ہیچ ہیں۔ اتنے عظیم مقصد کیلئے اگر ہماری ہزار جانیں بھی قربان ہوں تو حق ادا نہ ہو گا ـــــ

ایک صحابی کو کافروں نے گرفتار کر لیا، ان کے سامنے ان کے دو ساتھی آگ پر جلتے ہوئے تیل کی کڑاہی میں ڈال دئیے گئے۔ اور انہیں کہا گیا کہ عیسائیت اختیار کر لو ورنہ آپ کا بھی یہی حال ہو گا کہا تمہاری مرضی ہے، ڈال دو مگر کسی مجبور و بے کس کو اس طرح مجبور کرنا اور یہ طریقۂ تبلیغ عزت اور شرافت کے خلاف ہے، تین دفعہ کڑاہی تک انہیں لے جایا گیا۔ آخری مرتبہ صحابی کے آنسو ڈبڈبائے تو کافروں نے بلا کر کہا کہ شاید اب تم اپنے رویہ پر پشیمان ہو چکے ہو، اگر ایسا ہے تو اب بھی ہم تجھے چھوڑ دیں گے انہوں نے فرمایا ارے بیوقوفو! میں اس وجہ سے رو رہا ہوں کہ چند لمحظے بعد جب میں اللہ کے حضور پیش ہوں گا، تو کس منہ سے کہ صرف ایک جان تیرے لئے قربان کر دی۔ چاہئے تو یہ تھا کہ ہر بال کے بدلہ ایک روح ہوتی اور اسے قربان کر کے اللہ کے سامنے پیش کرتا تب سرخروئی ہوتی اس وجہ سے مجھے رونا آیا ـــــ تو اس پُر فتن دور میں علوم نبویہ اور قرآن و حدیث کیلئے اگر معمولی مشقت پیش آجائے تو یہ کچھ بھی نہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ تو بے حد رحیم ہیں۔ انہیں ہمارے ضعف اور کم حوصلگی کا اندازہ ہے۔ اس لئے ہم ابتلاء اور آزمائش بھی بہت کم آتی ہے۔ انبیاء کرامؑ اور صحابہ کرامؓ کا حوصلہ اور مقام بہت اونچا اور ایمان بہت مضبوط تھا۔ اس لئے ان کی ابتلا اور آزمائش بھی بہت سخت ہوا کرتی تھی۔ اشدّ الناس بلاءً الانبیاء ثم الامثل فالامثل۔ (لوگوں میں سخت آزمائش انبیاء کی ہوتی ہے۔ پھر اسکی جو ان سے جتنا قریب ہو۔)

ایسے دور میں کہ علم کا زوال ہے حدیث اور قرآن ختم کرنے یا اس میں تغیرّ و تبدّل کی کوششیں ہو رہی ہیں اور عالم کی جتنی توہین کی جا رہی ہے حالات اس قدر ناساز پہلے کبھی بھی نہ تھے مگر اس کے باوجود آپ طلبۂ علوم دین اور عام اہل علم کو جس اطمینان سے رزق میسر ہے وہ ایک رئیس کو بھی نہیں جو دینی ماحول مدرسہ میں آپ کو میسّر ہے، ایسا پرسکون ماحول اہل دنیا کو کہاں نصیب ـــــ؟ کوئی زانی، شرابی اور فاسق و فاجر نہیں، ہر ایک کی بغل میں بخاری شریف، مشکوٰۃ، جلالین، بیضاوی یا ہدایہ ہے۔ ایسا پاکیزہ ماحول آج کل بہت مشکل سے ملتا ہے۔

مجھے کچھ دوست لاہور سے بہت دور باہر جنگل میں ایک مدرسہ کی بنیاد رکھوانے لے گئے، میں نے پوچھا تم نے اتنا دور کیوں مدرسہ قائم کیا، انہوں نے کہا کہ ہم شہر کے اس غلیظ ماحول سے تنگ آچکے ہیں اور وہاں سے بچوں کو دور رکھ کر تعلیم و تربیت دینا چاہتے ہیں تو ایسے شہروں میں اتنے پرسکون ماحول کی قدر آتی ہے۔ اور اب قدر کا احساس اس وجہ سے نہیں کہ آسانی سے یہ حاصل ہے۔

اسی ماہ ڈھاکہ جانا ہوا تو وہاں ایک صاحب نے اپنے معصوم اور چھوٹے بچوں کو یہاں بھیجنے کی خواہش ظاہر کی دنیاوی وسائل انہیں بہت زیادہ حاصل ہیں۔ مگر انہوں نے بھی یہی کہا کہ ڈھاکہ وغیرہ شہروں کی حالت بہت بگڑی ہے، ایسے مقامات پر بچوں کی صحیح تربیت بہت مشکل ہے، ہم چاہتے ہیں کہ شہر کے گندے ماحول سے باہر بچوں کی تربیت ہو سکے۔ تو بہت حیثیتوں سے حق تعالیٰ نے اہل علم کو پرسکون اور اطمینان کی زندگی سے نوازا ہے۔ ہمارے اکابر کو حصول علم میں اتنی آسائش میسر نہیں تھی جو اس زمانہ کے طلبہ علم دین کو ہے اس وجہ سے کہ ہمتیں کمزور اور ضرورت بہت شدید ہے۔ اس لئے حق تعالیٰ اتنی آزمائش میں نہیں ڈالتے۔ ہمارے طالب العلمی کے دور میں بھی اس علاقہ میں بے حد تکالیف برداشت کرنی پڑتیں۔ طالب العلمی کے دور میں اس علاقہ کے ایک گاؤں میں ۶ ماہ کے عرصہ میں بہت کم ہی ایسا وقت آیا ہو گا کہ پیٹ بھر کر کھانا نصیب ہوا ہو۔ ایک جگہ پڑھنے کے دوران تو ایسا ہوا کہ کھیت سے گھاس پتے جمع کر کے ساگ پکوا لیا جاتا اور اسی پر گزر اوقات ہوتا۔ عام طور پر مساجد میں طلبہ کو باجرہ کی روٹی ملتی تھی۔ تیل کے چراغ سے مطالعہ ہوتا جو ذرا سے تیز جھونکے سے بجھ جاتا، عجیب بے نفسی کا زمانہ تھا۔ اساتذہ بھی ساتھ بیٹھ کر وہی باجرہ یا مکئی کی روٹی کھا لیتے ہمارے ایک استاد تھے، ان سے چند دن ملا حسن پڑھنا ہوا۔ موضع گڑھی کپورہ میں ان کے پاس ٹھہرے تھے وہ بھی مسافر تھے۔ اس وقت بہت ضعیف ہیں۔ اس وقت ان کی جوانی کا زمانہ تھا، بڑے شوق سے کتابیں پڑھاتے، کھانا اکٹھا ہو جاتا تو طالب علموں کے ساتھ بیٹھ جاتے، اسی مکئی کی روٹی اور لسی میں شریک ہو جاتے۔

امام بخاریؒ اپنے طالب العلمی کے زمانہ میں سبق میں حاضر نہ ہوئے، ساتھیوں نے معلوم کرنا چاہا تو پتہ چلا کہ گھر سے کچھ خشک روٹیاں ساتھ لائے تھے۔ دن میں ایک روٹی سے کام چلاتے۔ روٹیاں ختم ہوئیں تو رفتہ رفتہ سارے کپڑے فروخت ہوئے، ایک تہبند

رہتا تھا، مجبوراً اُسے بھی بیچ دینا پڑا۔ تو مجبوراً درس میں حاضر نہیں ہو سکے اور کواڑ بند کر کے اندر بیٹھ گئے۔ حضرت حفصؒ فرماتے ہیں کہ ساتھیوں کو پتہ چلا تو کچھ رقم اکٹھی کر کے ان کے لئے کپڑے خریدے تب کہیں وہ باہر آ کر سبق میں شریک ہونے لگے۔ غرض ایسی ایسی ابتلائیں اللہ تعالیٰ ہم ضعفاء پر نہیں لاتے، تو نعمتوں کا شکر ضروری ہے اس نعمت حاصل کرنے میں خود پسندی اور غرور سے بہت احتراز کریں کہ میں بڑا ذہین اور فہمیدہ ہوں، فلاں نے میری عزت نہ کی، اچھی نظروں سے نہ دیکھا۔ جھگڑا تو زر زن زمین پر ہوتا ہے، طالب العلمی میں تو ایسی ایک چیز بھی نہیں ہوتی، پھر جھگڑا اور اختلاف کیوں ہو، انانیت نکال دیں، نفس کو مٹا دیں تب علم حاصل ہوگا۔ العلم عزّ تحصیلہ بذل لاعزّ فیہ۔ علم عزت ہے مگر ذلت اور عاجزی سے حاصل ہوتا ہے۔

طالب علم میں جتنی تواضع اور مسکنت آئے گی اور اسکی زندگی میں جتنی بھی سادگی ہوگی اتنا ہی وہ علم حاصل کر سکے گا اور علم میں برکت ہوگی ہمارے ایک مخلص دوست جو ایک جید عالم ہیں انہوں نے ایک منصوبہ پیش کیا اور کئی حضرات کی ازراہ اخلاص ایسی رائے ہوتی ہے کہ طالبعلموں کی رہائش کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طرز پر ہو جائے کہ نوکر ہاتھ دھلائے کھانا کھلائے، کپڑے دھوئے اور کمرہ صاف کرے اور اسی طرح پر تکلف زندگی طلبۂ دین کو میسر ہو، میں نے کہا کہ برائے خدا ایسا مت کرو ورنہ اس طرح علم اور اسکی روح ختم ہو جائے گی، یہ دین کا علم ہے اور ذلت تواضع تکالیف اور مجاہدوں سے حاصل ہو سکتا ہے۔ جن لوگوں نے طالب علمی کی زندگی ٹھاٹ باٹ سے گذاری کہ تعیش کا دور دورہ تھا، صاف اور اجلے کپڑوں کی فکر تھی جاہ وجلال سے علم حاصل کرنا چاہا وہ اب علم سے کورے ہیں اور ان کا فیض معدوم ہے۔

امام محمد بن حسن شیبانی امیر خاندان سے تھے، امام ابو حنیفہؒ کی خدمت میں علم حاصل کرنے کی غرض سے حاضر ہوئے، آپ نے آزمانے کیلئے اونٹ یا بھینس کی تین بھری اوجریاں لانے کا حکم دیا، امام محمد قصاب خانہ گئے اور ایک ایک ہاتھ میں ایک ایک اوجری اٹھائی اور تیسری دانتوں میں دبا کر چلے آئے۔ شوق علم تھا اور طلب صادق تھی، تب امام ابو حنیفہؒ کو ان کے شوق اور تواضع کا احساس ہوا، اور شاگرد بنا لیا آگے چل کر امام کبیر بنے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسے بارعب پیغمبر جنکی ہیبت وجلال کی وجہ سے فرعون انکی گرفتاری کی جرأت نہ کر سکا غصہ اور جلال میں بال کھڑے ہو جاتے، مگر جب ایک مرحلہ طالبعلمی

کا آیا حضرت خضر کے پاس گئے تو انہوں نے بڑے رعب سے کہا کہ : انک لن تستطیع معی صبرا۔ علم کے لئے تو صبر و تحمل کی ضرورت ہے برداشت چاہیئے، حضرت موسیٰ نے جلال کا مظاہرہ نہ کیا بلکہ تواضع اور انکساری اختیار کی اور کہا کہ انشاء اللہ تو مجھے صبر کرنے والا پائے گا۔ منت سماجت کی کہ مجھے علم سکھا دیئے اگرچہ وہ علم بھی تکوینیات کا تھا اور غیر ضروری۔ پھر موسیٰ علیہ السلام اولوالعزم نبی اور رسول تھے اور ضروری علم علمِ شریعت انہیں حاصل تھا، اور استاذ کی نبوت بھی مختلف فیہ ہے، پھر بھی علم کی خاطر صبر و ضبط اور برداشت کا مظاہرہ فرمایا۔ تو علم کیلئے تواضع ضروری ہے، عرب کہتے ہیں : من قال انا وقع فی العنا۔ جس نے کہا میں ہوں وہ مشقت میں پڑ گیا۔ اس انا کو مٹانا چاہیئے۔ صوفیاء کا قول ہے کہ : العلم حجاب ـــــ علم پردہ ہے۔ تو علم سے مراد علم النفس ہے کہ میں بھی کچھ ہوں، تو صوفیاء کی غرض یہ ہے کہ اللہ اور بندہ کے درمیان علمِ نفس بڑا حجاب ہے۔ جاہل صوفیاء اس سے مراد علمِ ظاہر اور علمِ شریعت لیتے ہیں۔

امام شعرانی فرماتے ہیں کہ : ان لم تکن تراہ یعنی ان لم توجد تراہ ، کون، ثبوت، وجود، حصول ایک ہی چیز ہے کہ اپنے وجود اور ہونے کا احساس بھی نہ رہے تب اللہ کو پا سکو گے۔ یہ عصبیت قبائلی، قومی اور وطنی اور نفسانیت جب تک باقی ہو تو نہ خدا مل سکتا ہے نہ مقصد میں کامیابی ہوتی ہے۔ بہر تقدیر علم بڑی عزت ہے، اس کے سامنے آرام و راحت اور نفس پروری اور دنیا کی دیگر تمام آسائشیں ہیچ ہیں۔ حضورؐ سے بڑھ کر کون ہے مگر دنیا میں ان سے بڑھ کر متواضع کون مل سکتا ہے ـــــ؟

دوسری بات یہ ہے کہ حصول علم کو رضائے الٰہی کا ذریعہ بنالو۔ امام بخاریؒ نے حدیث انما الاعمال بالنیات ـ سے اپنی کتاب کا آغاز کیا کہ اعمال کی شرافت اور فضیلت کا دار و مدار نیت پر ہے، مشکوٰۃ شریف میں حدیث ہے کہ قیامت کے دن تین آدمی دوزخ میں ڈال دیئے جائیں گے، ان میں ایک ایسا عالم بھی ہوگا جس نے نام و نمود اور دنیاوی وجاہت کیلئے علم حاصل کیا ہوگا، اللہ تعالیٰ اسے فرمائے گا کہ تم نے تو عالم اور متعلم کہلانے کے لئے علم سیکھا اور وہ چیز تجھے دنیا میں مل چکی ہے، اسی طرح وہ شہید جو شہرت کیلئے جان دیدے، تیسرا وہ سخی جو لوگوں کے دکھلاوے کے لئے مال خرچ کرتا ہو اور اللہ کی رضا مقصود نہ ہو۔

الغرض یہ قضاء و افتاء اور مناصب دنیاوی کو غرض بنانا یہ شیطانی وساوس ہیں۔ علم پر خود عمل کرنے اور دنیا کو دعوتِ خیر دینے کیلئے یہ سارا کارخانہ بنا ہے ـــ ولتکن منکم امۃ یدعون

الی الخیر ویأمرون بالمعروف وینھون عن المنکر۔ (تم میں سے ایک جماعت ہونی چاہیے جو لوگوں کو نیکیوں کی طرف دعوت دے اور برائیوں سے روکے۔)

تو رضائے مولیٰ اور تقویٰ اگر حاصل ہوا تو پھر دنیا و آخرت میں کسی قسم کی تکلیف کا بھی خطرہ نہ ہوگا۔ قرآن کریم میں ویعلمھم الکتٰب والحکمۃ۔ (تعلیم کتاب وحکمت) سے پہلے ویزکیھم ہے۔ اور یہ اس لئے مقدم کر دیا کہ جب تک اخلاق حسنہ نہ ہوں قلب ذمائم سے صاف نہ ہو تو علم کتاب اور حکمت حاصل نہیں ہو سکتی۔ پلید برتن میں گھی یا دودھ ڈال دیا جائے تو وہ بھی نجس ہو جائے گا، ظرف کی نجاست کی وجہ سے علم کے نور سے محروم ہوتے ہیں۔ بہتوں کو دیکھا ہوگا کہ فاضل دیوبند و امینیہ اور مظاہر العلوم ہو کر بھی قادیانی پرویزی اور کیا کیا بن جاتے ہیں۔ اس لئے کہ کتاب وسنّت تو پڑھی مگر باطن صاف نہیں تھا۔ تو ہمیں اس کی ضرورت ہے کہ تزکیہ نفس ہو جائے، غیبت، غصہ، حسد، کینہ سے احتراز کریں، ایک دوسرے کو حقیر نہ سمجھیں اخلاق ذمیمہ سے احتراز کریں، دوسروں کیلئے گنجائش نکالیں کمرہ میں طعام میں، ایثار سے کام لیں ـــ دیوبند میں نئے طلباء کے قیام و طعام کا انتظام دس بارہ دن تک قدیم طلبہ ہی کرتے رہے، ایک دوسرے سے ہمدردی ہونی چاہئے۔ فافسحوا یفسح اللہ لکم۔ تم نے گنجائش پیدا کر دی تو خدا تم پر بھی آسائش سے آئے گا ہر چیز میں ـــ یفسح اللہ لکم فی العلم والعمل والدنیا والقبر والآخرۃ فی اللباس والاکل والشرب۔ علم، عمل دنیا و آخرت اور کھانے پینے ہر چیز کے لئے اس میں تعمیم ہے۔ اس لئے معقول متروک ہے ـــ زینۃ یحلی الی کل شیئ۔ جیسا ہے۔ نیز آپ کے چلنے پھرنے، اٹھنے بیٹھنے ہر چیز میں سنّتِ نبوی کی اتباع ہونی چاہیئے۔

حضرت جنیدؒ بغدادی کو حالتِ نزع میں خادم نے وضو کرایا۔ بڑی تکلیف اور مشقت سے وضو ہوا مگر خلال جو مستحب ہے چھوڑ دیا۔ حضرت نے پھر حکم دیا کہ دوبارہ وضو کراؤ اور خلال بھی کرا دو۔ لوگوں نے کہا حضرت آپ کو بڑی تکلیف ہے اور خلال تو آدابِ وضو میں سے ہے۔ فرمایا کہ ان آداب اور سنن ہی کی وجہ خدا نے یہ مقام دیا ہے، اب میں اللہ کے حضور جا رہا ہوں تو نبی کریم کی سنّت ترک کر کے جاؤں؟ اگر سنّت پر خود عمل نہ ہو تو پرویز، فضل الرحمان جیسے ملحدین اور منکرین سنّت کا مقابلہ کیسے ہوگا، عمل میں کوتاہی اور سنّتِ رسول ترک کرنے کی وجہ سے آج علماء کی بے وقعتی ہے

آپ کی ہر حرکت سنت کے مطابق ہونی چاہیئے۔ خواہ حلقۂ درس میں ہوں یا باہر، اگر درس میں بیٹھے ہوں اور آپ آنے جانے والے مہمانوں کو دیکھیں تو وہ یہی سمجھیں گے کہ اسے کتاب کے ساتھ لگاؤ نہیں، اس لئے تو کتاب اور استاذ کی بجائے اسکی توجہ ادھر اُدھر ہے۔
اسی طرح ڈاڑھی جو کہ سنت ہے اس کا نہایت اہتمام ہونا چاہیئے۔ یہ جو ہر دوکان اور ادارہ پہ کتبہ یا بورڈ لگا ہوتا ہے اسی طرح ڈاڑھی مسلمان ہونے اور حضورؐ کے امتی ہونے کا لیبل ہے، اگر کسی کا لیبل فساق جیسا ہو تو وہ منبر پر کھڑا ہو کر لوگوں کو سنتوں کی تلقین اور منکرات کا بیان کیسے کرسکے گا۔ علماء نے لکھا ہے کہ ڈاڑھی مونڈھنا اور تراشنا قبضہ سے کم دونوں فسق ہیں ۔۔۔ تو حضرت جنیدؒ نے فرمایا کہ قرب خداوندی کے اسباب اور وسائل تو یہی سنن اور آداب ہی ہیں۔ اسی طرح علم کا باطنی سبب استاذ کا احترام بھی ہے اگر استاد اور شیخ کو ملازم کی حیثیت سے سمجھے تو ہرگز علم حاصل نہ ہوسکے گا۔ انگریزی علوم کو تو چھوڑیئے کہ وہ ہے ہی ملازمت اور اکثر علوم بے دینی کے ہیں، وہ بے ادبی سے حاصل بھی ہوں تو تعجب نہیں حضرت شمس الائمہ سرخسی کا ایک علاقہ میں جانا ہوا، ایک شاگرد ملاقات کو بہت دیر سے آیا۔ اور عذر بیان کیا کہ والدہ کی علالت اور تیمارداری کی وجہ سے حاضر نہ ہوسکا، انہوں نے فرمایا کہ انہیں عمر تو بہت ملے گی مگر علم کی برکت نہ ہوگی، یعنی والدین کی خدمت کی خاصیت یہ ہے کہ عمر بڑھ جائے مگر استاذ سے بے اعتنائی کی خاصیت علم کی برکت سے محرومی ہے۔ تو استاد کی عظمت نہ ہونے کی وجہ سے بڑے سے بڑا ذہین بھی فیض سے محروم ہوجاتا ہے یہ علم اساتذہ کے جوتے سیدھے کرنے سے ملتا ہے کیونکہ استاذ کا ادب و احترام برقرار رہے گا تو استاذ کی دعا ملے گی ۔۔۔ اسی طرح تحریر اور تقریر میں موجودہ تقاضوں کے مطابق پوری استعداد اور قابلیت حاصل کرنا ضروری ہے، اس وقت صرف چند طلبہ کو علم پڑھانا ہی خدمت نہیں بلکہ باہر میدان میں ملحدین اور اہل فتن کی تردید اور کلمۂ حق اچھے سے اچھے طریقہ سے پہنچانا بھی ضروری ہے۔ اگر دشمن کے پاس ایٹم بم ہے اور تمہارے پاس صرف ایک لاٹھی ہے، تو اس سے مقابلہ نہیں ہوسکے گا۔ مخالفین تقریر و تحریر سے لوگوں کو گمراہ کر رہے ہیں، طلبہ کو ان دونوں چیزوں سے غافل نہیں رہنا چاہیئے۔ ایک بات اور بھی ذہن نشین کرلیں کہ ہمارا مسلک حنفی ہے اسے راجح سمجھتے ہیں اور سب آئمہ کو حق پر سمجھتے ہیں مگر امام ابوحنیفہؒ کے مقلد ہیں، کسی کی بے ادبی نہیں کرتے امام ابن تیمیہ اور ابن قیم کا بھی احترام دلوں میں موجود ہے مگر ہمارا مسلک حنفی اور مشرب دیوبندی ہے۔ آپ فروعی اختلافات میں نہ پڑیں اور طالب علمی کا ہر لحظہ قیمتی اور غنیمت سمجھیں۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔۔

مولانا قاضی محمد زاہد الحسینی صاحب

قرآنِ مجید کی تفسیر بیان کرتے ہوئے یا قرآنی احکام اور مطالب کا مطالعہ کرتے ہوئے ذہن میں اس بات کو حاضر رکھنا چاہیئے کہ اصل بات تو وہی ہے جو قرآنی تعلیمات سے معلوم ہوتی ہے میرا اپنا ذاتی نظریہ کوئی نہیں، قرآنِ مجید نے فرمایا:

ولا تقف ما لیس لک بہ علم (اسراء ۳۶) اور نہ یقین کر اس پر جس کا تجھے علم (دلیل) نہ ہو

علم اور دلیل کے بغیر اللہ تعالیٰ کی بات کی تشریح اور تفسیر کئی گمراہیوں کا راستہ کھول دیتی ہے شیطان کا یہ بھی ایک داؤ ہے کہ وہ انسانوں کو اس بات پر آمادہ کر دیتا ہے کہ وہ بلا علم اور دلیل کے کسی بات یا حکم کو اللہ تعالیٰ کا حکم کہہ کر غلط بات کو صحیح کرنے کی جسارت کر ڈالیں — فرمایا:

وان تقولوا علی اللہ ما لا تعلمون (بقرہ ۱۶۹) اور یہ کہ تم اللہ پر وہ کچھ کہہ ڈالو جو تم نہیں جانتے

اسی کو اصطلاحِ شریعت میں تفسیر بالرائے کہا جاتا ہے جس کے متعلق سیدِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

مَنْ فَسَّرَ الْقُرْآنَ بِرَایِہٖ فَلْیَتَبَوَّأْ مَقْعَدَہٗ مِنَ النَّارِ ۔ جو قرآن کی تفسیر اپنی خواہش سے کرے اس کو جہنم کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔

اور رائے کا مطلب یہی ہے کہ اس میزان کو چھوڑ کر بغیر علم و دلیل کے تفسیر کی جائے جیسا کہ دوسرے

ارشاد میں ہے :

من قال فی القرآن بغیر علم فلیتبوء مقعدہ من النار -

ایسی تفسیر اور تشریح جو علوم و قوانین تفسیریہ کو بالائے طاق رکھ کر کی جائے اگر وہ درست بھی نکلے تب بھی اجر و ثواب کا مستحق نہیں بلکہ عنداللہ وہ مجرم ہی سمجھا جائے گا. آپؐ نے فرمایا :

من تکلم فی القرآن برائیہ فاصاب فقد اخطا - (ابو داؤد - نسائی - ترمذی)

تفسیر بالرائے کے متعلق مصر کے عظیم ادیب طٰہٰ حسین سابق وزیر تعلیم کا تبصرہ درج کیا جاتا ہے

" میں کہہ سکتا ہوں کہ مؤولین (تفسیر بالرائے کرنے والے) خواہ قدماء میں سے ہوں یا فلاسفہ میں سے، ان کی تاویلات دور از کار ہیں. انہوں نے عقل کو راہ نمائی سونپی اور دھوکہ کھا گئے. انہوں نے وہ باتیں کہیں جو ان کے منہ سے نہیں نکلنی چاہیئے تھیں. انہیں سزاوار یہ تھا کہ حد سے آگے قدم نہ بڑھاتے جس جگہ ان کی قوت فہم ادراک اور شعور اور بلوغ ختم ہو گئی تھی وہیں ٹھٹھک کر رہ جاتے. یہ ان کے لیئے بہت بہتر ہوتا. ان کے لیئے بھی اور ان لوگوں کے لیئے بھی جنہیں انہوں نے فتنے میں مبتلا کر دیا تھا. ان کی دور از کار تاویلات نے عجیب عجیب گل کھلائے ہیں. جیسا کہ قرآن مجید میں طیراً ابابیل کا ذکر آیا ہے وہ چڑیاں جنہوں نے مکے کی حملہ آور حبش فوج پر کنکریاں پھینک کر اسے تباہ کر دیا تھا. یہ عقل پرست طیراً ابابیل سے وبا مراد لیتے ہیں اور کنکریوں سے مراد غیر مرئی جراثیم، یہ تاویل انہوں نے اپنی طرف سے کی حالانکہ سب اچھی طرح جانتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہ کرامؓ نے سورۃ فیل کا یہ مطلب نہیں لیا تھا، اور نہ اس نہج پر اسے سمجھا تھا اور وہ اس نہج پر سمجھ بھی نہیں سکتے تھے یہ ان کے زیب کب تھا. وہ میکروب (جراثیم) سے بالکل ناواقف تھے. اسی طرح جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ قرآن میں سبع سماوات سے مراد کواکب وسیارہ ہیں یہ بھی اٹکل پچو بات ہے یہ ایسی بات کہہ رہے ہیں جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہؓ نے کبھی نہیں فرمائی " (اسلام منزل بمنزل صہ۳۰۶)

جیسا کہ طلوع اسلام کا ایڈیٹر پرویز اسی سورۃ کی تفسیر میں تحریف معنوی نہیں، بلکہ تحریف لفظی تک کر گیا. سورۃ الفیل کا ترجمہ یوں کیا :

" (جماعت قریش) تم نے دیکھا نہیں کہ تمہارے پروردگار نے ہاتھیوں والوں

(ابرہہ اور اسکی فوج) کے ساتھ کیا کیا تھا۔ ؟ تمہارے پروردگار نے ان کی خفیہ تدابیر کو بے سود نہیں بنا دیا تھا۔ ؟ اور ان پر پرندوں کے جھنڈ کے جھنڈ نہیں بھیج دئیے تھے تم (تمہاری قوم) ادھر سے ان پر پتھراؤ کر رہے تھے، چنانچہ اس طرح تمہارے پروردگار نے انہیں کھائے ہوئے بھوسے کی طرح بنا کر ڈال دیا تھا۔"

اس ترجمہ کی تفسیر پرویز صاحب نے یہ کی :

واقعہ یہ تھا کہ یمن کے عیسائی حاکم ابرہہ (جو شاہ حبش کا گورنر تھا) ۵۷۰ء میں حضور کا سن ولادت ہے۔ ارادہ کیا کہ مکہ کو فتح اور خانہ کعبہ کو منہدم کر دیا جائے تاکہ عربوں کی مرکزیت فنا اور قریش کی سیادت تباہ ہو جائے۔ اس کے لئے اس نے بجائے اس کے کہ برملا اعلانِ جنگ کرتا اپنے ساتھ ہاتھیوں کی ایک عظیم الشان فوج لے کر خفیہ خفیہ بڑھنا شروع کیا۔ اس یورش کے لئے حج کا موسم تجویز کیا، جب عربوں میں لڑائیوں کا سلسلہ منقطع یا ملتوی ہو جاتا تھا اور پھر ایام تشریق کہ جن میں تمام عرب ہتھیار الگ رکھ کر رسوم حج کی ادائیگی میں مصروف ہو جاتے۔ مزید برآں اس نے مانوس راستہ کو چھوڑ کر پہاڑیوں کے پیچھے پیچھے چور راستہ اختیار کیا تاکہ کسی کو اس حرکت دیورش کا علم ہی نہ ہونے پائے تاآنکہ وہ مکہ پر حملہ آور ہو جائے یہ تھے اس کے مکائد (خفیہ تدابیر) عرب اس کی آمد سے بے خبر تھے، لیکن اللہ تو بے خبر نہیں تھا، اس نے ایک ایسا سبب پیدا کر دیا جس سے یہ تمام راز طشت از بام ہو گیا۔ گدھ اور چیلیں ہمیشہ لاشوں اور مرداروں کی تلاش میں رہتی ہیں، گذشتہ زمانہ میں جب کبھی لشکر ادھر ادھر جنبش کرتے تو وہ اپنی فطری ذہانت سے بھانپ لیتیں کہ کہیں ان کی ضیافت کا سامان ہونے والا ہے۔ چنانچہ وہ ان کے ساتھ ساتھ ہو لیتیں۔ ابرہہ نے زمین پر تو تمام حفاظتی تدابیر اختیار کر لیں کہ اس کا راز آشکارا نہ ہونے پائے لیکن آسمان پر تو اسے کچھ اختیار حاصل نہیں تھا۔ عربوں نے دیکھا کہ گدھوں کے گدھ منڈلاتے چلے آرہے ہیں، تو انہوں نے خبر رساں ایجنسیوں سے فوراً بھانپ لیا کہ ان کے سائے میں کوئی لشکر بڑھے آرہا ہے۔ حج کے موقع پر اجتماع عظیم موجود تھا، سب اردگرد کی پہاڑیوں پر چڑھ گئے۔ اب صورت یہ ہو گئی کہ نیچے وادیوں میں ابرہہ کا لشکر ہے اور پہاڑیوں پر عربوں کا ہجوم ــــ نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن ــــ ازمنہ گذشتہ کے فنون حربیہ سے واقفیت رکھنے والے جانتے ہیں کہ سنگ باری اس زمانہ کے کیسے موثر حربات میں سے تھی ہزار ہزار من کی چٹانیں اوپر سے لڑھکا دی جاتیں جو اپنے ہی MUMENTUM اور سے اس شدت

سے نیچے آتیں کہ جو ان کی زد میں آجاتا اس کا بھرکس نکل جاتا۔ آنِ واحد میں ہاتھی اور ان کا لشکر بھس بن کر رہ گیا۔"
(معارف القرآن جلد چہارم صفحہ ۳۶۶ و صفحہ ۳۶۷)

اقبال مرحوم نے شاید انہی کے لئے فرمایا تھا ۔

وسے تاویل شان در حیرت انداخت خدا و جبریل و مصطفےٰ را

اس تحریف کا جواب مفصلاً علماء اسلام دے چکے ہیں۔ یہاں صرف معارف قرآنی کے طور پر کچھ عرض کیا جاتا ہے۔ ادھر تو پرویز صاحب یہ کہتے ہیں کہ ابرہہ نے ایام حج میں بیت اللہ پر حملہ کیا کہ یہ مہینے ان کے نزدیک قابل احترام تھے اور وہ لڑنا حرام سمجھتے تھے۔ اور ادھر یہ بھی کہتے ہیں کہ پہاڑوں پر چڑھ گئے اور ہزار ہزار من کی چٹانیں لڑھکا دیں، دونوں باتوں میں تضاد ہے۔ علماء تاریخ اور سیرت کا بیان ہے کہ اس واقعہ کے چالیس دن بعد سید دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت ہوئی، تو اس لحاظ سے محرم کے آخری ایام ہونے چاہئیں۔ حج تو ذوالحج کی تیرھویں تاریخ تک ختم ہو جاتا ہے۔ اور عرب لوگ واپس جا چکے ہوں گے۔

فائدہ | اَصْحٰبِ الْفِیْلِ کے اس واقعہ کی تشریح سیرت اور تاریخ کی سب کتابوں میں موجود ہے حتیٰ کہ غیر مسلم مفکر بھی اس کے قائل ہیں۔ تفصیل انسائیکلو پیڈیا آف اسلام میں ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔

اس تفسیر بالرائے کے لئے تاریخی حقائق کو جس قدر مسخ کیا گیا اور احادیث کی مستند روایات کو کس طرح چھوڑا گیا۔ یہ مستقل تفصیل طلب بحث ہے۔ یہاں قرآنیات کے طلباء کے لئے صرف اسی قدر عرض کیا جاتا ہے کہ :

۱۔ الم تر کا مخاطب جماعت قریش کو بنایا گیا تاکہ آگے آنے والے فعل ترمیہم کا فاعل بھی جماعت قریش کو بنایا جائے۔ بتانا یہ ہے کہ ان حملہ آوروں کو پتھر مارنے والے وہ پرندے نہ تھے۔ بلکہ تم خود تھے۔ تو یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر قریش ہی نے اُن کو پتھر مارے تو پھر ان کے لئے تعجب کی کیا بات تھی۔؟ وہ خود ہی تو کر رہے تھے اور دیکھ رہے تھے۔

۲۔ الم تر اور ترمی دونوں واحد مونث کے صیغے بنا دئیے گئے۔ پرویز صاحب کا خیال ہے کہ جماعت کا کلمہ مونث ہے تاویلاً، تو فعل اسی لئے مونث لایا گیا۔ تو پھر ربّکَ کی ضمیر خطاب کا کیا بنے گا اس لحاظ سے تو ربّکَ میں یہ ضمیر بھی مونث کی لائی جاتی، جیسا کہ الم تر کو مونث مخاطب بنایا گیا۔ الم تر کا مخاطب مونث اور ربّکَ کا مخاطب مذکر، یہ کس قاعدہ نحوی اور بیانی کے تحت ہو۔

۳۔ اسی طرح سجیل کا کلمہ قرآن مجید میں تین مرتبہ آیا ہے۔ فرمایا:

الف۔ وامطرنا علیہا حجارۃ من سجیل (ھود ۸۲) اور برسائے ہم نے اس بستی پر پتھر کنکر جیسے۔

ب۔ وامطرنا علیہم حجارۃ من سجیل۔ (الحجر ۷۴) اور برسایا ہم نے ان لوگوں پر مینہ کنکروں کا۔

ج۔ ترمیہم بحجارۃ من سجیل (الفیل ۴) مارتے تھے وہ پرندے ان کو پتھر کنکر جیسے۔

پہلی دو آیتوں میں قوم لوط پر آسمان سے پتھروں کا برسانا مراد ہے جہاں قوم لوط کی بستیاں آباد تھیں۔ وہاں کونسی وادی یا درہ تھا، یا کس نے ان کو روک کر اوپر سے پتھر برسائے تھے۔ پھر لفظ سجیل کا معنیٰ۔ امام لغت قرآنی امام راغب نے فرمایا والسجیل حجر وطین۔ یعنی پتھر اور کیچڑ، امام راغب نے فرمایا کہ بعض کے ہاں یہ لفظ فارسی سے معرب کیا گیا ہے، جیسا کہ امام تفسیر ابن عباس رضی اللہ عنہ نے اس کا ترجمہ سنگ وگل فرمایا ہے۔ قرطین میں اس کا ترجمہ آجر پختہ اینٹ کے سنگریزے کیا گیا ہے، جمہور مفسرین کا یہی قول ہے۔ (مدارک)

بلکہ تیسری صدی کے امام لغت القرآن (م ۲۷۶ھ) نے فرمایا: ولھذا ذھب قوم فی تفسیر سجیل الی سنگ وگل ای حجر وطین۔ (بحوالہ لسان العرب ج ۱۳، ص ۳۴۷) یہی تفسیر جلیل القدر مفسرین جیسا کہ امام ابن جریر طبری م ۳۱۰ھ امام قرطبی م ۶۵۵ھ امام رازی م ۶۰۶ھ نے فرمائی۔ اور اگر یہ علماء لغت اور تفاسیر کے اقوال نہ بھی ہوتے تب بھی قرآن مجید نے خود اس کی تفسیر دوسری جگہ سورہ الذاریات آیت ۳۲-۳۳ میں فرما دی۔ ارشاد ہے:

قالوا انا ارسلنا الی قوم مجرمین انہوں (فرشتوں) نے کہا ہم ایک مجرم قوم

لنرسل علیہم حجارۃ من طین۔ کی طرف بھیجے گئے تاکہ ان پر مٹی ملے پتھر (کنکر) برسائیں۔

صاف معلوم ہوتا ہے کہ پتھر کسی پہاڑی کے نہ تھے بلکہ یہ تو سنگریزوں کی شکل کے تھے اور وہ ان کے لئے عذاب کے طور پر واقع ہوئے۔ ان پتھروں کو دیکھا گیا، جو ابرہہ کی فوج پر گرے تھے۔ علامہ زمخشری بھی اس واقعہ کی صداقت کا قائل ہے اس نے اپنی تفسیر میں لکھا کہ "حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ انہوں نے ام ہانی رضی اللہ عنہا کے پاس ایک بڑی ٹوکری ان پتھروں کی دیکھی جو ابرہہ کی اس فوج پر گرائے گئے تھے۔ یہ پتھر حجم میں چنے سے چھوٹے اور مسور سے بڑے تھے۔ (کشاف)

★★

تحریر : علامہ محمد اسد صاحب (حال مقیم مراکش)
ترجمہ : جناب محمد معین خان بی۔اے (عثمانیہ)

مسلمان اور مسئلہ تعلیم

مغربی طرز تعلیم کے اثرات

مسلمان جب تک مغربی تہذیب پر اس اعتبار سے نظریں جمائے رہیں گے کہ گویا یہی وہ واحد قوت ہے جو ان کی اپنی جامد تہذیب کے عروقِ مردہ میں خونِ زندگی دوڑائیگی، اس وقت تک وہ اپنی خود اعتمادی کی بنیاد کو اپنے ہی ہاتھوں برباد کرتے رہیں گے اور بالواسطہ طور پر مغرب کے اس دعویٰ کی حمایت کرتے رہیں گے کہ اسلام "ایک درماندہ قوت" ہے۔

گذشتہ ابواب میں اس رائے کی تائید میں چند دلائل پیش کئے گئے ہیں کہ اسلام اور مغربی تہذیب چونکہ قطعی متضاد و متبائن تصورات حیات پر مبنی ہیں۔ اس لئے ان کے اندازِ فکر و نظر میں کوئی موافقت پیدا ہی نہیں ہو سکتی۔ جب صورتِ حال یہ ہو تو ہم یہ کیسے توقع کر سکتے ہیں کہ مسلم نوجوانوں کو دی جانے والی مغربی طرز کی تعلیم جو بالکلیہ یورپی ثقافت کے اقدار و تجربات پر مبنی ہوتی ہے، اسلام دشمن موثرات سے پاک و مبرا رہ سکے گی۔؟

اگر ہم ایسی توقع کریں بھی تو ہماری یہ توقع قطعاً حق بجانب نہیں ہو سکتی۔ ان مستثنیات کے قطع نظر جن میں ایک نہایت ہی غیر معمولی ذکی و طباع ذہن کسی تعلیم کے مضرات سے مغلوب نہیں ہوتا، یہ امر یقینی ہے کہ مغربی طرزِ تعلیم حضور رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام کے ساتھ مسلم نوجوانوں کے

تعلق ایمانی کو مسمار کر دے گی، اور ان کے اس تصور کے پرخچے اڑا دے گی کہ وہ اسلام کی مخصوص دینی تہذیب کے نمائندے ہیں۔ اس بات میں ذرا بھی شبہ نہیں کیا جا سکتا کہ جن "دانشوروں" نے مغربی طرز پر تعلیم پائی ہے، ان کا رہا سہا مذہبی عقیدہ بھی روز بروز نسیاً منسیاً ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اسلام نے ایک عملی مذہب کی حیثیت سے اپنی سالمیت کو غیر تعلیم یافتہ طبقات میں محفوظ و مامون کر لیا ہے۔ تاہم یہ بالعموم دیکھنے میں آتا ہے کہ مغرب زدہ دانشوروں کے مقابلہ میں ان غیر تعلیم یافتوں کی طرف سے اسلام کی آواز پر لبیک کی صدائیں زیادہ جوش و خروش کے ساتھ بلند ہوتی ہیں۔ دانشوروں کی اس مذہب دوری کی توجیہہ یہ نہیں ہے کہ مغربی سائنس نے جس کی ان لوگوں کو تعلیم دی گئی ہے، ہماری مذہبی تعلیمات کی سچائی کے خلاف کوئی معقول دلیل و برہان پیش کر دی ہے۔ بلکہ بات یہ ہے کہ جدید مغربی تہذیب کا ذہنی ماحول اس شدت کیساتھ مذہب دشمن واقع ہوا ہے کہ وہ مسلمانوں کی نئی پود کی مذہبی توانائیوں پر خبیث جن کی طرح مسلط ہو جاتا ہے۔

ایسا تو شاذ ہی ہوتا ہے کہ کفر و ایمان صرف دلیل و حجت کی بناء پر دلوں میں جاگزیں ہوتے ہوں۔ کبھی کبھی یہ وجدان یا مثلاً درک و بصیرت کے راستے دلوں میں اترتے ہیں۔ لیکن اکثر صورتوں میں انہیں قلب انسانی میں منتقل کرنے والا ذریعہ خود انسان کا ثقافتی ماحول ہوتا ہے۔ ایک ایسے بچہ کی مثال لیجئے جسے ابتدائی عمر ہی سے پکے راگ سننے کی باقاعدہ تربیت دی جاتی ہے۔ اس کے کان لَے، سُر اور آہنگ میں تمیز کرنے کے عادی ہوتے چلے جاتے ہیں، اور بڑا ہو کر وہ اگر خود پکے راگ گانے کا اہل نہ بھی بنے تو کم از کم انتہائی دشوار قسم کی موسیقی کو سمجھنے کا اہل ضرور بن جاتا ہے۔ لیکن ایک ایسا بچہ جسے اپنی ابتدائی عمر میں موسیقی جیسی کوئی چیز سننے کا کبھی اتفاق ہی نہ ہوا ہو تو وہ بڑا ہو کر موسیقی کی مبادیات کی خوبیوں کو بھی سمجھنے کے قابل نہیں ہو سکے گا۔ یہی حال مذہب کیساتھ ارتباط و تعلق کا بھی ہے۔ جسطرح فطرت بعض افراد کو موسیقی کے معاملہ میں گوش شوق کی نعمت سے یکسر محروم کر دیتی ہے، اسی طرح دنیا میں ایسے افراد بھی پائے جاتے ہیں جن کے کان مذہب کی آواز کے معاملہ میں بالکل بہرے ہوتے ہیں۔ لیکن نوع بشر کی اکثریت کے حق میں کفر و ایمان کا فیصلہ وہ ماحول کرتا ہے جس میں اسے نشو و نما ملتی ہے۔ اسی لئے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

مامن مولود الا یولد علی الفطرۃ	ہر بچہ پاکیزہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے لیکن اس
فابواہ یہودانہ او ینصرانہ	کے ماں باپ اسے یہودی یا نصرانی یا مجوسی
او یمجسانہ۔ (صحیح بخاری)	بنا دیتے ہیں

مندرجہ بالا حدیث میں "ماں باپ" کی جو اصطلاح استعمال ہوئی ہے، اس کو منطقی اعتبار سے عام ماحول —— خاندانی زندگی، سکول اور معاشرہ وغیرہ —— پر بھی پھیلایا جا سکتا ہے جس سے بچہ کی ابتدائی نشوونما متعین و مشخص ہوتی ہے۔ اس بات سے تو قطعی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ موجودہ دور اختلاط میں کئی مسلم گھرانے ایسے ملیں گے جن کا مذہبی ماحول اس قدر پست اور ذہنی اعتبار سے اتنا زوال ہوتا ہے کہ پروان چڑھتے ہوئے نوجوانوں کو یہ ماحول سب سے پہلے اپنے ہی مذہب سے روگرداں ہو جانے کی ترغیب دیتا ہے۔ قرینہ تو یہی کہتا ہے کہ صورت ایسی ہی کچھ ہے۔ لیکن ان صورتوں میں جہاں مسلم نوجوانوں کو مغربی طرز پر تعلیم دی جا رہی ہو۔ اس کا نتیجہ یقیناً یہی برآمد ہوگا کہ یہ نوجوان آگے چل کر مذہب دشمن رویہ اختیار کر بیٹھیں گے۔

اب یہاں ایک بڑا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جدید آموزش کے بارہ میں ہمارا طرز عمل کیا ہونا چاہیئے —— ؟

مسلمانوں کو مغربی تعلیم دینے کے خلاف احتجاج کرنے کے معنی ہرگز یہ نہیں ہو سکتے کہ اسلام تعلیم ہی کا مخالف ہے۔ ہمارے مخالفوں نے اسلام پر جو اس قسم کا الزام تھوپا ہے اس کی نہ تو کوئی فقہی بنیاد ہے اور نہ تاریخی۔ قرآن مجید تو اس قسم کے بیانات سے بھرا پڑا ہے، "تاکہ تم سمجھدار بن جاؤ۔" "تاکہ تم سوچو"۔ "تاکہ تم جانو"۔ قرآن مجید کے شروع میں یہ ارشاد ملتا ہے۔

وعلم آدم الاسماء کلھا۔ (۲ : ۳) اور اس نے آدم کو سارے اسماء سکھا دیئے۔

اور اس کے بعد کی آیات یہ بتلاتی ہیں کہ ان "اسماء" کے علم کی بدولت انسان کو ایک اعتبار سے فرشتوں پر بھی فضیلت حاصل ہو گئی۔ "اسماء" دراصل قوت توضیح اصطلاحات کے اشاراتی مظہر ہیں۔ فکر و ادراک کی وہ قوت جو انسان کے لئے مختص ہے اور جو قرآن مجید کے ارشاد کے بموجب اس کو زمین پر خلیفۃ اللہ کے منصب کا اہل بناتی ہے، اپنی فکر سے ایک قاعدہ کے مطابق کام لینے کیلئے انسان پر لازم ہے کہ وہ علم حاصل کرے۔ اور اسی لئے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

من سلک طریقاً یلتمس فیہ علماً سھل اللہ لہ بہ طریقاً الی الجنۃ — جو علم کی جستجو میں راستہ طے کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے لئے جنت کا راستہ آسان کر دیتا ہے۔

(صحیح بخاری)

ان فضل العالم علی العابد کفضل القمر لیلۃ البدر علی سائر الکواکب — ایک عالم کو عابد پر ایسی ہی فضیلت ہے جیسی کہ بدر کامل کو کواکب پر۔

(مسند ابن حنبل، جامع الترمذی، سنن ابو داؤد، سنن ابن ماجہ، سنن الدارمی)

لیکن تحصیل علم کے بارہ میں اسلامی رویہ کی مدافعت کے لئے قرآنی آیات یا احادیث نبوی کے حوالوں کی چنداں ضرورت نہیں ہے کیونکہ خود تاریخ پورے وثوق کے ساتھ یہ ثابت کر رہی ہے کہ روئے زمین پر کسی مذہب نے اسلام کے برابر سائنسی ترقی کی تحریک وتشویق کا سامان مہیا نہیں کیا۔ بنو امیہ، بنو عباس اور ہسپانیہ کی اسلامی حکومت کے زمانوں میں جو نہایت شاندار ثقافتی کارنامے انجام پائے ہیں وہ اس حوصلہ افزائی کا نتیجہ ہیں جو تحصیل علم اور سائنسی تحقیقات کو اسلامی فقہ سے ملی تھی۔ یورپ اس حقیقت سے یقیناً بخوبی آگاہ ہوگا، کیونکہ خود اسکی ثقافت پر اسلام کے جو احسانات ہیں وہ ان احسانات سے کسی طرح کم نہیں ہیں جو صدیوں کی جہالت کے بعد نشاۃ ثانیہ نے اس پر کئے ہیں۔ لیکن ذکر احسان سے ہمارا مقصود یہ نہیں ہے کہ ہم ایسے وقت ان عظیم الشان یادوں پر فخر کریں جبکہ دنیائے اسلام خود اپنی روایت فراموش کر چکی ہے اور بے بصری اور عقلی افلاس کے گڑھے میں جا گری ہے۔ ہمیں کوئی حق نہیں پہنچتا کہ موجودہ مسکنت اور پستی میں اپنی عظمت ہائے رفتہ پر ڈینگیں ماریں۔ بلکہ ہم پر تو یہ فریضہ عائد ہوتا ہے کہ ہم اس بات کو اچھی طرح محسوس کرلیں کہ یہ مسلمانوں کی غفلت شعاری تھی نہ کہ خود اسلامی تعلیمات کی کوئی خامی جس نے ہمیں تنزل وانحطاط کے اس درک اسفل میں دھکیل دیا۔

اسلام نے ترقی سائنس کی راہ میں کبھی روڑے نہیں اٹکائے اسلام تو انسان کی ان تمام ذہنی سرگرمیوں کو وقعت کی نگاہ سے دیکھتا ہے جو اسے مرتبہ میں فرشتوں سے بھی بالا کر دیں۔ دنیا کے کسی مذہب نے شعور وعقل اور نتیجتاً تحصیل علم کو زندگی کے دیگر تمام مظاہر پر اس شدومد کے ساتھ ترجیح نہیں دی۔ اگر ہم اسلام کے اصولوں کی پیروی کریں تو ہمارے دل میں جدید علوم کی تحصیل کو اپنی زندگی کے دائرہ سے خارج کر دینے کا قطعاً کوئی خیال پیدا نہیں ہو سکتا۔ ہمیں بیشک علم حاصل کرنے اور ترقی کی منزل پر منزل مارنے اور معاشی اور سائنسی اعتبار سے مغربی اقوام کی طرح لائق و کارکردہ بننے کی ضرور آرزو کرنی چاہیئے، لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بات بھی خوب ذہن نشین رہنی چاہیئے کہ ہم مغرب کی آنکھ سے دیکھنے اور مغرب کے دماغ سے سوچنے کی آرزو ہرگز نہ کریں۔ اگر ہم دنیا میں مسلمانوں کی حیثیت سے زندہ رہنا چاہتے ہیں تو ہمیں چاہیئے کہ ہم اسلام کی روحانی ثقافت کو مغرب کے مادہ پرستانہ تجربات سے بدلنے کی قطعاً آرزو نہ کریں۔

علم فی نفسہ نہ تو مغربی ہے اور نہ مشرقی۔ یہ ایسا ہی آفاقی ہے جیسے حقائق فطرت ــــ لیکن زاویۂ نظر جس سے حقائق دیکھے اور پیش کئے جاتے ہیں، قوموں کے ثقافتی مزاج کے بموجب

بدلتا رہتا ہے۔ اس حیثیت سے علم حیوانات ہو کہ علم نباتات یا علم طبعیات، اپنی اصل و غایت کے اعتبار سے نہ تو مادہ پرستانہ ہیں اور نہ روحانی۔ ان علوم کا تعلق تو حقائق کے مشاہدہ اجماع اور تعلیف اور ان حقائق سے عام ضابطوں کے استنباط سے ہے۔ لیکن ان سے ـــــ یعنی فلسفہ و سائنس سے ـــــ ہم جو استقرائی فلسفیانہ نتائج استنباط کرتے ہیں وہ محض حقائق و مشاہدات پر مبنی نہیں ہوا کرتے بلکہ وہ بہت بڑی حد تک زندگی اور اس کے مسائل کے بارہ میں ہمارے مزاجی یا وجدانی رویہ سے بھی اثر پذیر ہوا کرتے ہیں۔ جرمنی کے عظیم فلسفی کانٹ کا قول ہے کہ "ہماری عقل اپنے نتائج فطرت سے اخذ نہیں کرتی بلکہ انہیں فطرت کے لئے تشخیص کرتی ہے۔ یہ بات بظاہر ایک عجوبہ سی لگتی ہے، لیکن واقعتاً ہوتا ایسا ہی ہے"۔ مختصر یہ کہ اس سلسلہ میں جو چیز اہمیت رکھتی ہے۔ وہ صرف ایجابی زاویۂ نگاہ ہے کیونکہ ہم معروض کی جو تشریح کرتے ہیں اس کو ہمارا زاویۂ نگاہ سرتاسر بدل سکتا ہے۔

اسطرح سائنس جو فی نفسہٖ نہ تو مادہ پرستانہ ہے اور نہ روحانی، ہمیں کائنات کی بے انتہا انتشاد پذیر تشریحات کی ڈگر پر ڈال دیتی ہے ـــــ یعنی ایسی تشریحات جو ہمارے رجحان کے بموجب روحانی بھی ہو سکتی ہیں اور مادہ پرستانہ بھی۔ مغرب اپنی بے انتہا نکھری ہوئی عقلیت پسندی کے باوصف مادہ پرستانہ رجحان کا حامل ہے اس لئے وہ اپنے تصوّرات اور بنیادی مفروضات کے اعتبار سے مذہب دشمن ہے۔ بریں بناء مغربی نظام تعلیم کا بھی بالجملہ مذہب دشمن ہونا ایک امر لازمی ہے۔ دوسرے الفاظ میں اسلام کی ثقافتی صداقت کے لئے جو چیز مضرت رساں ہے وہ جدید تجربی علوم کا مطالعہ نہیں بلکہ مغربی تہذیب کی روح ہے جس کے وسیلہ سے مسلمان ان علوم تک رسائی حاصل کرتے ہیں۔

یہ ہماری کتنی بڑی بدنصیبی ہے کہ ہم خود اپنی ہی بے التفاتی اور غفلت شعاری کے ہاتھوں سائنسی تحقیقات کے معاملہ میں علم کے مغربی ماخذوں کے محتاج بن گئے ہیں۔ اگر ہم نے اسلام کے اصول کی ہمیشہ پیروی کی ہوتی جکی رو سے ہر مسلمان پر تحصیل علم کا فریضہ عائد ہوتا ہے تو ہم جدید علوم کیلئے آج مغرب کی طرف یوں نظریں اٹھا اٹھا کر نہ دیکھتے جیسے ریگستان میں شدت تشنگی سے جاں بلب آدمی افق پر سراب کی جانب دیکھتا ہے۔ مسلمان چونکہ ایک عرصہ دراز سے خود اپنے ممکنات سے غفلت برتتے رہے۔ اس لئے وہ جہالت و افلاس میں جا گرے۔ درانحالیکہ

یورپ جرأت مندی سے آگے ہی آگے قدم بڑھاتا چلا گیا۔ اس فرق و اختلاف کی خلیج کو پاٹنے کیلئے ایک طویل عرصہ درکار ہوگا۔ اس وقت تک ہمیں جدید علوم کو مجبوراً مغربی طریق تعلیم کی وساطت سے قبول کرنا ہوگا۔

اس کا مطلب صرف یہی ہے کہ ہم صرف سائنسی مواد و منہاج (SCIENTIFIC MATTER AND METHOD) اخذ و قبول کریں گے اور اس کے علاوہ کوئی چیز نہیں۔ دوسرے الفاظ میں مغربی علوم قطعیہ کا مطالعہ کرنے سے ہم بالکل ہی نہ ہچکچائیں۔ البتہ مسلم نوجوانوں کی تعلیم میں مغربی فلسفہ کے کسی بھی جزو کو ہرگز ہرگز راہ پانے نہ دیں۔ سوال یہ پیدا ہو سکتا ہے کہ اس وقت بہت سے علوم قطعیہ مثلاً جوہری طبیعیات خالص تجربی تحقیق و تفحص کی سرحدوں کو عبور کر کے فلسفہ کے میدانوں میں داخل ہو چکے ہیں لہٰذا کئی صورتیں ایسی ہیں جن میں تجربی سائنس اور قیاسی فلسفہ کے مابین خطِ امتیاز کا کھینچنا انتہائی دشوار ہے۔ یہ ایک طرف تو بالکل صحیح ہے، لیکن دوسری طرف ٹھیک یہی وہ مقام ہے جہاں ثقافتِ اسلامیہ کو اپنا وجود از سرِ نو منوانا ہوگا۔ یہ مسلم سائنسدانوں کا فرض ہے کہ جب وہ ایک مرتبہ سائنسی تفحص کے آخری کنارہ پہ پہنچ جائیں تو اس وقت مغرب کے فلسفیانہ نظریات سے دامن جھاڑ کر خود اپنے ہی قیاسی استدلال کی قوتوں کو منطبق کرنا شروع کر دیں۔ بہت ممکن ہے کہ وہ خود اپنے ہی یعنی اسلامی نظرِ فکر سے ایسے ایسے نتائج استنباط کر جائیں جو مغربی سائنسدانوں کی اکثریت کے استنباط کردہ نتیجوں سے بالکل مختلف ہوں۔

مستقبل میں خواہ کچھ ہی پیش آئے، مغرب کے ذہنی رویّہ کے آگے غلامانہ سرِ تسلیم خم کئے بغیر سائنس کا سیکھنا اور سکھانا آج بھی ممکن ہے۔ آج دنیائے اسلام کو جس چیز کی فوری اور اشد ضرورت ہے، وہ کسی نئے فلسفیانہ نظریہ کی نہیں بلکہ صرف جدید سائنسی اور فنی ساز و سامان کی ہے۔

اگر ہمیں ایک ایسی مثالی مجلسِ تعلیم کے آگے جو صرف اسلامی ملحوظات کے تابع ہوتی، اپنی تجاویز پیش کرنے ہوتے تو ہم اس امر پہ بہت زور دیتے کہ مسلم اسکولوں میں مغرب کی تمام ذہنی تحصیلات کے منجملہ صرف علوم فطرت اور ریاضی کی تعلیم دی جائے اور ان اسکولوں کے تعلیمی نصاب میں آج جو برتری یورپی فلسفہ، ادب اور تاریخ کی تدریس کو حاصل ہے وہ یک قلم موقوف کر دی جائے۔ ہماری اس تجویز سے یورپی فلسفہ کے بارہ میں ہمارے رویّہ کی پوری پوری وضاحت ہو جاتی ہے۔ رہا یورپی ادب، اس کو کبھی نظر انداز نہ کیا جائے ــــ

لیکن اتنی بات ضرور ہونی چاہیئے کہ اس ادب کو اس کے اپنے صحیح فلسفیانہ موقف کی طرف لوٹا دیا جائے۔ اس وقت مسلم ممالک میں جس انداز سے یہ ادب پڑھایا جا رہا ہے، وہ تعصب و جانبداری سے مبرا نہیں ہے۔ یورپی ادب کے اقدار کے بارہ میں جو بے پناہ مبالغہ آرائی کی گئی ہے۔ اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ مبالغہ خام و ناپختہ ذہنوں کو مغربی تہذیب کی روح کو، قبل اس کے کہ وہ اس روح کے سلبی پہلوؤں کو اچھی طرح سمجھنے کے اہل بن سکیں پورے طور پر اخذ و قبول کرنے پر مائل کر لیتا ہے۔ اس طرح مغربی تہذیب کے ساتھ نہ صرف ایک افلاطونی محبت کا میدان ہی تیار ہو جاتا ہے۔ بلکہ اس تہذیب کی عملی تقلید ــــــ جو روح اسلام کے منافی ہے ـــ کے لئے راہیں بھی ہموار ہو جاتی ہیں۔ اسلامی ثقافت کے تعمق و ثروت کو طلباء کے ذہن نشین کرانے اور اس کے مستقبل کے بارہ میں طلباء کے دلوں میں امید کی ایک نئی جوت جگانے کی غرض سے یہ نہایت ضروری ہے کہ مسلم اسکولوں میں جو حیثیت اس وقت یورپی ادب کو حاصل ہے، وہ ایک معقول اور متمیز اسلامی ادب کے حوالہ کر دیا جائے۔

اگر یورپی ادب کی تعلیم جس صورت میں کہ وہ آج متعدد مسلم اداروں میں مروج ہے، مسلم نوجوانوں کو اسلام سے توڑ دیتی ہے۔ تو یہی بات اس سے بھی کہیں زیادہ تاریخ عالم کی یورپی تشریح پر بھی صادق آتی ہے۔ اس تشریح میں "رومی بمقابلہ وحشی" کا قدیم انداز خود یورپ ہی کا انداز ہو گیا ہے۔ اہل یورپ کی طرف سے تاریخ کی پیش کشی کا مقصد (مقصد کو تسلیم کئے بغیر) یہ ثابت کرنا ہوتا ہے کہ یورپی اقوام اور ان کی تہذیب ہر اس چیز سے ارفع و اعلیٰ ہیں جو اس دنیا میں پیدا کی گئی ہے یا پیدا کی جا سکتی ہے۔ چنانچہ اس سے ماتبقی دنیا میں اہل یورپ کی جستجوئے اقتدار کو ایک طرح کا اخلاقی جواز مل جاتا ہے۔ اہل روما کے زمانہ سے یورپی اقوام مشرق و مغرب کے باہمی اختلافات کو ایک مفروضہ یورپی "معیار" کے نقطۂ نظر سے دیکھنے کی عادی چلی آ رہی ہیں۔ ان کا استدلال اس مفروضہ پر عمل کئے جاتا ہے کہ نوع البشر کی نشو و فروغ کا اندازہ صرف یورپ کے ثقافتی تجربات کی بنیاد ہی پر کیا جا سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے تنگ زاویہ نظر سے جو بھی تناظر پیدا ہوگا، وہ لازماً ٹیڑھا میڑھا اور اصلیت سے بعید ہوگا۔ یورپی نقطۂ نظر کی مروجہ اساس سے خطوط مشاہدہ جتنی دور پیچھے کی طرف ہٹتے چلے جاتے ہیں۔ اہل یورپ کے لئے تاریخی معروضات کو ان کے اصلی رنگ و روپ میں استدراک کرنا اتنا ہی دشوار ہو جاتا ہے۔

اہل یورپ کے اس انا۔ مرکزی (EGO - CENTRIC) رویہ کے باعث ان کی توصیفی تاریخ عالم (DESCRIPTIVE HISTORY OF THE WORLD) حال حال تک فی الحقیقت مغرب کی مطول تاریخ (ENLARGED HISTORY OF THE WEST) کے سوا کچھ نہ تھی۔ اس تاریخ میں غیر یورپی قوموں کا تذکرہ صرف اس حد تک روا رکھا جاتا تھا، جس حد تک ان قوموں کے وجود و فروغ یورپ کے مقدرات پر براہ راست اثر انداز ہوتے تھے۔ اس کی مثال ایسی ہی ہے کہ آپ یورپی اقوام کی تاریخ کا نقشہ شرح و بسط کے ساتھ اور صاف و واضح رنگوں میں کچھ اس انداز سے کھینچیں کہ ما بقی اقطاع عالم کی صرف دو چار جھلکیاں دکھانے پر اکتفا کر جائیں۔ اس تاریخ کو پڑھ کر بیچارہ قاری اس التباس میں مبتلا ہو جائے گا کہ سماجی اور ذہنی اعتبار سے یورپ کے کارناموں کی عظمت اتنی بلند ہے کہ باقی دنیا کے کارناموں کو ان سے کوئی نسبت ہی نہیں ہو سکتی۔ اور اس سے قریب قریب یہ بھی ظاہر ہونے لگے گا کہ دنیا کی تخلیق گویا محض یورپ اور اس کی تہذیب ہی کی خاطر عمل میں لائی گئی ہے۔ اور دیگر تمام اقوام اور تہذیبوں کی تخلیق کی غرض و غایت ہی یہی تھی کہ وہ عظمت یورپ کے لئے ایک مناسب ماحول پیدا کریں۔ غیر یورپی نوجوانوں کے ذہنوں پر اس قبیل کی تواریخی تربیت کا صرف یہی اثر پڑ سکتا ہے کہ وہ خود اپنی ہی ثقافت، اپنے ہی تاریخی ماضی اور اپنے ہی مستقبل کے ممکنات کے بارہ میں ایک احساس کمتری میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اس طرح ان نوجوانوں کو اپنے ہی مستقبل سے حقارت کرنے کی باقاعدہ تعلیم و تربیت دی جاتی ہے۔

ان مذموم و مہلک اثرات کے سدباب کے لئے فکر اسلامی کے رہنماؤں کو چاہیئے کہ وہ مسلم اداروں میں تاریخ کی تعلیم و تربیت کے طریق و اسلوب کو از سر نو ترتیب دینے کی امکان بھر کوشش کریں۔ بلاشبہ یہ ایک مشکل کام ہے جو اس امر کا متقاضی ہے کہ مسلم نقطۂ نگاہ کے بموجب ایک جدید تاریخ مدون ہونے سے پہلے ہی ہمارے پورے نظام تدریس تاریخ کے ایک ایک کل پرزے کی خوب جانچ پڑتال کر لی جائے۔ لیکن کام اگر مشکل ہے تو وہ ممکن بھی ہے اور نہایت اہم اور ناگزیر بھی۔ ورنہ نفرتِ اسلام کی زہریں لہروں سے ہماری نئی پود کے ذہنوں کی آبیاری کا سلسلہ یوں ہی چلتا رہے گا۔ جس کا یہ نتیجہ ہوگا کہ ہمارے نوجوانوں کا احساس کمتری زیادہ سے زیادہ شدید ہوتا چلا جائے گا۔ بلاشبہ اس احساس کمتری کو اس طرح بھی قابو میں لایا جا سکتا ہے۔ کہ مسلمان مغربی ثقافت کو بہ تمام و کمال اخذ و جذب کر لیں اور اپنی زندگی کی حدود سے

اسلام کو نکال باہر کرنے پر آمادہ و تیار ہو جائیں۔ لیکن کیا مسلمان ایسا کرنے پر آمادہ ہو سکتے ہیں۔؟

ہمارا یہ ایقان ہے اور مغرب کے حالیہ واقعات ہمارے اس ایقان کی توثیق کرتے ہیں کہ اسلام کی اخلاقیات، اس کے سماجی اور شخصی اخلاقِ معدلت و حریت کے تصورات مغربی تہذیب کے متقابل تصورات و خیالات کی بہ نسبت بے انتہا اعلیٰ اور اکمل ہیں۔ اسلام نے نسلی نفرت کا قلع قمع کر دیا۔ اور انسانی اخوت و مساوات کی راہیں کھول دیں۔ لیکن مغربی تہذیب ہنوز اس قابل نہیں ہے کہ نسلی اور قومی عداوتوں کے تنگ و تاریک افق کے پار دیکھ سکے اسلام کے معاشرہ کے اندر آج تک طبقات، اور طبقاتی جنگ کا کوئی سوال پیدا ہی نہیں ہوا۔ لیکن اس کے برخلاف یونان و روما سے لیکر ہمارے زمانہ تک کی ساری یورپی تاریخ طبقاتی کشمکش اور سماجی نفرت سے بھری پڑی ہے۔ اس امر کا بار بار اعادہ ہونا چاہئے اور پورے شد و مد کے ساتھ ہونا چاہئے کہ صرف ایک ہی چیز ایسی ہے جو مسلمان مغرب سے سود مندانہ طریقہ سے سیکھ سکتے ہیں، اور وہ ہے علوم قطعیہ اپنی خالص اور اطلاقی صورت میں۔ لیکن یہ امر ذہن نشین رہے کہ باہر سے حصول علم کی یہ ضرورت کسی مسلمان کو ہرگز یہ ترغیب نہ دینے پائے کہ وہ مغربی تہذیب کو اپنی تہذیب کے مقابلہ میں برتر و فائق سمجھے ——— ورنہ ایسا مسلمان اسلام کے مقصد و منہاج سے قطعاً بے بہرہ ہوگا۔ کسی ثقافت یا تہذیب کو دوسری ثقافت یا تہذیب پر جو فوقیت حاصل ہوتی ہے وہ مادی علوم کے وسیع تر ذخیرہ کی ملکیت پر مشمول نہیں ہوتی بلکہ وہ مشمول ہوتی ہے اس تہذیب یا ثقافت کی اخلاقی توانائی پر، حیات انسانی کے تمام پہلوؤں کی تشریح و ترتیب کے وسیع تر امکان پر۔ اور اس باب میں اسلام کو دیگر تمام ثقافتوں پر فوقیت حاصل ہے ضرورت تو صرف احکام اسلام کے اتباع کی ہے تاکہ اس کی بدولت ہم وہ سب کچھ حاصل کر سکیں جس کا حاصل کرنا نوعِ بشر کے امکان و استعداد میں ہے۔ لیکن اگر ہم سچے دل سے اسلامی اقدار کو محفوظ رکھنا اور ان کو حیات نو بخشنا چاہتے ہیں تو ہمیں چاہئے کہ مغربی تہذیب کی تقلید کا سودائے خام یکسر اپنے دماغ سے نکال دیں، کیونکہ مغربی تہذیب کے ذہنی اثر سے جب اسلام کو جو نقصان پہنچے گا، وہ اس تہذیب کی تقلید سے حاصل ہونے والے نفع کے مقابلہ میں کہیں زیادہ بھاری ہوگا۔

سائنسی تحقیقات کے معاملہ میں جو غفلت مسلمانوں سے ماضی میں سرزد ہوئی ہے اسکی تلافی مغربی علوم کی بے قید و بند قبولیت سے ہرگز نہیں کی جا سکتی۔ ہماری تمام تر سائنسی

(باقی صہ ۴۹ پر)

حضرت علامہ مناظر احسن گیلانی مرحوم

سائنسی ایجادات کا سرچشمہ کون ہے

علمی و فکری قوتوں کا نتیجہ
یا
قدرت کی کرشمہ پردازی؟

سورۂ کہف میں باغ اور کاشت رکھنے والے آدمی کو یعنی لسطی پیمانے پر جسے رزق دی گئی تھی. اسی کے متعلق کہنے والوں کی زبان سے یہ فقرہ جو کہلوایا گیا ہے۔

لولا اذ دخلت جنتک قلت ماشاء اللہ لاقوۃ الا باللہ۔ — اور کیوں نہ ہوا ایسا کہ جب تو اپنے باغ میں داخل ہوا تو کہا ہوتا کہ جو کچھ ہے سب اللہ کا چاہا ہے۔ نہیں ہے قوت لیکن اللہ ہی سے۔

جس کا حاصل یہی ہے کہ نعمتوں کو پالینے کے بعد آدمی کو چاہیئے کہ واقعہ کے مطابق ان کے متعلق جو صحیح دانش اور علم ہو، اس کو اپنے سامنے سے اوجھل ہونے نہ دے۔ مثلاً باغ والے کے سامنے اس کا باغ تھا، حکم دیا گیا کہ اس باغ میں جب جایا کرو تو دو باتیں سوچا کرو، ایک تو یہ کہ جو کچھ ہے سب اللہ کا چاہا ہوا ہے، اور دوسری بات یہ کہ قوت اور طاقت جو کچھ بھی جس کسی میں ہے اس کا سرچشمہ حق تعالیٰ کی ذات مبارک ہے، ظاہر ہے کہ پہلی بات کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ جن شکلوں میں نعمتوں کا ظہور ہوا ہو ان کو دیکھ کر چاہیئے کہ اس واقعہ کے احساس کو ہم اپنے اندر پیدا کرتے رہیں کہ ان کی آفرینش اور پیدائش سے ہمارا کوئی تعلق نہیں ہے، بلکہ یہ سب کچھ قدرت کی کارفرمائیوں کا نتیجہ و اثر ہے۔ باغ ہی کو دیکھئے، باغ کی زمین، باغ کے درخت، درختوں کی شاخیں، پتے، پھول پھل، اسی طرح وہ سارے اسباب جنہیں باغ کی نشو و نما بار آوری میں دخل ہے، ان میں کوئی چیز بھی ایسی ہے جسے آدمی پیدا کرتا ہے، باغ تو خیر باغ ہی ہے۔

انسانی مصنوعات اور قدرت کی کارفرمائی	الٰہی چیزیں جنہیں ہم انسانی مصنوعات خیال کرتے

ہیں، بلکہ جن مصنوعات کے متعلق عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ فلاں کی ایجاد ہے، مثلاً ریل گاڑی اور اس کے انجن ہی کو لیجئے، سوچئے، انجن کے اجزاء لوہا، تانبا، پیتل، انجن کے فلزاتی وغیرہ عناصر اور اس کے سوا جو چیزیں اس کے بنانے میں استعمال ہوتی ہیں، کیا ان میں سے کسی ایک چیز کے پیدا کرنے والے ہم ہیں۔ اسی طرح انجن جن چیزوں سے چلتا ہے، بتائیے کہ آگ ہو یا پانی، کیا آدمی ان کا پیدا کرنے والا ہے، پانی کو آگ پر چڑھانے سے اسٹیم پیدا ہوتی ہے، کیا پانی اور آگ میں یہ خاصیت آدمی کی رکھی ہوئی ہے۔ کھلی ہوئی بات ہے کہ یہ بھی قدرت ہی کا بنایا ہوا قانون ہے، اسٹیم میں حرکت پیدا کرنے کی قوت ہے، کیا اس قوت کو آدمی نے پیدا کیا ہے؟ سوچتے چلے جائیے، اگر آپ حقیقت پر نظر جماتے ہوئے سوچیں گے تو بالآخر ہر سوال کے جواب میں آپ کو وہی "ماشاء اللہ" کہنا پڑے گا، یعنی سب اللہ کا چاہا ہوا ہے، اور اسی کی قدرت کی یہ کرشمہ پردازیاں ہیں، یہ تو پہلے فقرے ماشاء اللہ کا مطلب ہوا، رہی دوسری بات یعنی "لاقوۃ الا باللہ" یہ اس وسوسہ کے ازالہ کی طرف اشارہ ہے جو عموماً ایسے موقعہ پر دلوں میں پیدا ہوتا ہے یا ہو سکتا ہے، خیال یہ گذرتا ہے کہ ہیں تو یہ سب کچھ قدرتی پیداوار اور قدرتی قوانین ہی کے نتائج، لیکن انسان جب تک ان قوانین کا علم نہ حاصل کرے اور علم حاصل کرنے کے بعد اپنی محنت و توجہ کو ان پر صرف نہ کرے، عقل کی ترکیبوں اور ذہن کی تجویزوں کو ان میں نہ لگائے، انجن کا وجود نہیں ہو سکتا۔ اور انجن ہی کیا، باغ میں جب تک باغبانی کے قواعد و قوانین کی پابندی نہ کی جائے گی، اس وقت تک جیسا کہ چاہئے اس کے پھلنے پھولنے کی کیا صورت ہو سکتی ہے۔ اور اتنا حصہ ان چیزوں میں یقیناً آدمی کا ہے، اسی وجہ سے ان چیزوں کو انسانی مصنوعات و ایجادات میں لوگ شمار کرتے ہیں، ورنہ اتنا احمق کون ہو گا جو سمجھتا ہو کہ انجن کے لوہے یا اس میں جو آگ جلتی ہے، جو پانی خرچ ہوتا ہے۔ ان چیزوں کا ایجاد کرنے والا اور پیدا کرنے والا آدمی ہے۔

علمی و عملی قوتوں کا خالق اللہ ہے | دراصل اسی کے متعلق اس دوسرے فقرے میں چاہا گیا ہے کہ ٹھیک ٹھیک حقیقت اور واقعہ کے بالکل مطابق اپنے علم کو کر لیا جائے، یعنی یہ سوچنا چاہئے کہ بلاشبہ ان امور کے ظہور میں انسانی ترکیبوں اور تدبیروں کو دخل ہے۔ لیکن ہمیں اپنے آپ سے یہ پوچھنا چاہئے کہ ان ترکیبوں اور تدبیروں کا تعلق انسان کی جن علمی و عملی قوتوں سے ہے، خود ان قوتوں کا پیدا کرنے والا کون ہے، کھلی ہوئی بات ہے کہ ہم جب خود اپنے پیدا کرنے والے نہیں ہیں تو ان قوتوں کے پیدا کرنے والے ہم کیسے ہو سکتے ہیں جو ہمارے اندر پائی جاتی ہیں، بلکہ

جو ہمیں پیدا کرنے والا ہے، ظاہر ہے کہ اسی کے ارادہ و مشیت سے ہماری ان قوتوں کا بھی تعلق ہے۔ "لا قوۃ الا باللہ" دراصل اسی واقعہ کی یافت کا نام ہے۔

اس کی شہادت | یوں بھی اگر سوچا جائے کہ جن ایجادات و انکشافات کو ہم اپنی اپنی دماغی قابلیتوں، فکر و غور کی محنتوں کی طرف منسوب کرتے ہیں، کیا واقعی وہ ہمارے فکری نتائج ہوتے ہیں میں آپ کے سامنے دو چیزیں پیش کرتا ہوں، ایک واقعہ تو یہ ہے کہ جدید مصنوعات و ایجادات یا انکشافات جن لوگوں کی طرف منسوب ہیں، زیادہ تر میرا خیال ہے کہ اگر صد فی صد نہیں تو ۹۰ فیصد یہ وہی لوگ ہیں جنہیں باضابطہ تعلیم کا یا تو سرے سے موقعہ ہی نہیں ملا، یا کچھ تھوڑی بہت ابتدائی تعلیم کسی نے حاصل بھی کی ہے یا تو عام طور پر اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقات کے مقابلہ میں ان کی تعلیم صفر کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس بیسویں صدی کے موجد اعظم ایڈیسن ہی کو لیجئے، اس بہرے موجد کی سوانح عمری سے کون واقف نہیں، سوال یہی ہے کہ اگر آدمی کی فکری وعقلی قوتوں کے نتائج یہ ایجادات ہیں تو چاہیئے کہ عقلی قوتوں کی تربیت کا جن لوگوں کو اعلیٰ تعلیم گاہوں میں موقعہ ملا یا ملتا رہتا ہے، ان کا دماغ ایجاد کرنے میں سبقت کرتا، لیکن جب واقعہ یہ نہیں ہے تو غور کرنے کی بات ہے کہ ان انکشافات و ایجادات کو ہم کس چیز کا نتیجہ قرار دیں۔ دوسری بات اسی کے ساتھ جسے میں پیش کرنا چاہتا ہوں، وہ یہ ہے، شاید دوسرے بھی جانتے ہوں کہ ان ایجادات و انکشافات کے متعلق ایک عجیب انکشاف یہ بھی ہے کہ عموماً کسی ایک ایجاد کا خیال کسی ملک میں کسی شخص کے دماغ میں جب آیا تو ٹھیک ان ہی دنوں میں یہ دیکھا گیا ہے کہ بالکل دور دراز ممالک کے رہنے والوں میں سے بھی کسی کے دماغ میں بھی ٹھیک ان ہی دنوں میں اس ایجاد کا خیال آیا۔ مصر کے مشہور عیسائی مجلہ الہلال کی اشاعت ۱۹۲۲ء نومبر میں ایک مقالہ میں اسی "توارد" کے متعلق شائع ہوا ہے۔ استقراء و تتبع سے مقالہ نگار نے عہد حاضر کی ۱۴۳ ایجادوں کے متعلق ثابت کیا ہے کہ ایک ہی زمانے میں دو مختلف ملکوں کے باشندوں کو ان کا توارد ہوتا رہا ہے۔ مثلاً امریکہ میں ایک بات کسی کی سمجھ میں آئی، ٹھیک اسی ہفتہ میں دیکھا گیا کہ انگلستان کا ایک آدمی بھی اپنے دماغ میں اسی کا خیال پا رہا ہے۔ آخر بتایا جائے کہ اس توارد کی کیا توجیہ ہو سکتی ہے۔

اختر راہی بی۔اے

مفتی صدر الدین آزردہ

صدر الصدور دہلی

گداز جسم، سانولا رنگ، چھوٹی چھوٹی آنکھیں ذرا اندر کو دھنسی ہوئی۔ بھری ہوئی ڈاڑھی بہت سیدھی سادھی وضع کے آدمی ہیں۔ ظاہری نمائش سے کوئی سروکار نہیں۔ بدن میں سفید ایک بر کا پائجامہ، سفید کرتہ اور سفید ہی عمامہ ——— یہ ہیں مفتی صدر الدین آزردہ، جو اصلاً کشمیری ہیں۔ ان کے والد لطف اللہ غالباً تجارت کی غرض سے دہلی آئے اور یہیں سکونت پذیر ہو گئے ۱۲۰۴ھ (۱۷۸۹ء) میں صدر الدین پیدا ہوئے کسی نے تاریخ پیدائش لفظ "چراغ" سے نکالی ہے۔ درحقیقت مفتی صاحب کی ذات ایک "چراغ" ہی تھی جس سے سینکڑوں چراغ روشن ہوئے۔ دیوبند اور علی گڑھ دونوں کے بزرگوں نے اس "چراغ" سے اکتساب فیض کیا تھا۔

تعلیم | مروجہ منقولات کی تعلیم خانوادۂ ولی اللہی کے عظیم فرزندوں۔ شاہ عبدالعزیزؒ، شاہ عبدالقادرؒ اور شاہ محمد اسحاقؒ سے حاصل کی۔ اور معقولات کی تحصیل مولوی فضل امام خیر آبادیؒ سے کی۔ زمانے کی روش کے مطابق خوشنویسی میں کمال حاصل کیا۔ اس فن میں بہادر شاہ ظفر سے تلمذ کا شرف حاصل تھا۔

ملازمت | انگریزی حکومت کی طرف سے دہلی کے صدر الصدور مقرر ہوئے۔ سر سید احمد خان لکھتے ہیں:

"انگریزوں کو اس بات کی بڑی خواہش جستجو رہتی تھی کہ مسلمانوں کے خاندانی اور ذی وجاہت اشخاص افتا، صدارت کے مناصب قبول کر لیں تاکہ شمالی ہند میں

انگریزی حکومت عوام میں مقبول ہوسکے ہندوستانیوں کے لئے بڑے سے بڑا عہدہ صدرالصدور بعدالت کا تھا۔ اس لئے اکابر و افاضل کو یہی پیش کیا جا سکتا تھا۔ دہلی چونکہ قدیم دارالحکومت اور اسلامی تہذیب کا مرکز تھی۔ اس لئے یہاں کی صدارت کے لئے خصوصیت سے اہتمام کیا جاتا تھا۔ کلکتہ سے صاحب کلاں (ریذیڈنٹ) کو لکھا گیا کہ امرائے شہر اور بادشاہ سے مشورہ کرکے کسی ایسے شخص کو صدرالصدور مقرر کریں جس کی وجاہت اور علم و فضل مسلمانوں میں مسلّم ہو۔ ریذیڈنٹ نے بادشاہ اور امرائے شہر سے مشورہ کیا۔ سب کی رائے ہوئی کہ مولوی صدرالدین منظور کرلیں تو ان سے بہتر کوئی شخص نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ بادشاہ اور امراء ثقات کے متفقہ اصرار سے انہوں نے یہ عہدہ قبول کرلیا۔"

دورانِ ملازمت میں فرائضِ منصبی کماحقہ پورے کئے۔ بڑے بڑے ارکانِ سلطنت کو ان پر اعتماد تھا۔ جب جنرل آکڑلونی راجپوتانہ کا ریذیڈنٹ مقرر ہوا تو آپ اس کے ہمراہ چار سو روپیہ ماہانہ مشاہرے پر رہے۔ آکڑلونی کو ان پر بہت زیادہ اعتماد تھا۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی　مولوی احمداللہ شاہ مدراسی جہاد کی روح سے سرشار گوالیار سے دہلی گئے۔ دہلی اس دور میں علماء و فضلاء اور صوفیاء کا مرکز تھی، ایک ایک صاحب اثر سے مل کر حالات کی نزاکت واضح کی، لیکن کسی کے سینے میں وہ آگ روشن نہ پائی جس سے خود سراپا سوز تھے۔ دہلی بھر میں مفتی صدرالدین ہی تھے جنہوں نے جہاد پر آمادگی کا اظہار کیا اور مولوی احمداللہ شاہ کو مشورہ دیا کہ دہلی کی بجائے آگرہ کو تنظیمی مرکز بنایا جائے۔ مفتی موصوف نے مفتی انعام اللہ وکیل کے نام ایک تعارفی خط دیا جو آگرہ میں مقیم تھے، اسی تعارفی خط کی بدولت مولوی احمداللہ شاہ کی آگرہ میں بڑی خاطر مدارات ہوئی اور جنگ آزادی کی تڑپ پیدا کرنے میں کامیاب ہوئے۔

غدر کے ابتدائی ایام میں عدالت کا کام چھوڑ چھاڑ کر گوشہ نشینی اختیار کرلی تھی۔ لیکن تا بکے ہنگامۂ آزادی زوروں پر تھا۔ بخت خان بریلی سے دہلی آیا اور علماء نے ایک فتویٰ جہاد مرتب کیا۔ جس پر مفتی صاحب نے بھی دستخط کئے۔ یہی وہ "دستخط" تھے جن کی بنا پر مرکز عتاب بنے۔

عتاب　دستخط کرنے کی پاداش میں منصب سے محروم کردیے گئے۔ جائداد ضبط کرلی گئی۔ تین لاکھ روپے کی مالیت کا کتب خانہ بھی ضبط ہوگیا۔ جس کے حصول لاہور میں لارڈ لارنس سے بھی ملے لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ مقدمہ چلنے لگا۔ آخر میں کامیاب ہوئے۔ مولانا ابوالکلام آزاد

رقمطراز ہیں :

مفتی صاحب نے بھی اس فتویٰ (جہاد) پر دستخط کئے تھے۔ دستخط کے نیچے "کتبت الخیر" لکھ دیا تھا۔ عربی میں عبارت کے خاتمے پر اس قسم کے اختتامی الفاظ لکھنے کا رواج ہے، لیکن انہوں نے "بالخیر" کی "ی" کے نقطے نہیں دیتے تھے۔ غدر کے بعد ان کی روبکاری ہوئی اور فتویٰ پیش کیا گیا۔ تو انہوں نے کہا: ہاں! ٹھیک ہے میں نے دستخط کئے تھے، لیکن میں مجبور تھا، اور مجھ سے بہ جبر و تشدد دستخط لئے گئے تھے۔ میں نے صاف لکھ دیا تھا۔ "کتبت بالجبر"

مولانا آزاد کی رائے ہے کہ یہ محض کوئی لطیفہ نہ تھا، بلکہ مفتی صاحب نے بالقصد یوں ہی کیا تھا۔ چنانچہ باعزت بری ہو گئے۔ بعد ازاں فنانشل کمشنر اور لیفٹیننٹ گورنر نے نصف جائداد واگذاشت کر دی۔ منقولہ جائداد جو نیلام ہو چکی تھی نہ مل سکی۔

ملازمت سے بعد کی زندگی | ملازمت سے علیحدگی کے بعد جو نصف جائداد واگذاشت ہوئی تھی۔ اس کے کرائے پر معاش تھا۔ کرایہ صرف تیس چالیس روپے ماہانہ تھا۔ لیکن نیک دلی اور اقربا نوازی کا یہ عالم تھا کہ اپنے بعض متعلقین کی اولاد کی کفالت بھی کرتے تھے۔ مرزا غالب حکیم سید احمد حسن مودودی کو لکھتے ہیں :

"اگرچہ یہ امداد (کرایہ) ان کے گزارے کو کافی ہے۔ کس واسطے کہ ایک آپ اور ایک بی بی۔ تیس، چالیس مہینے کی آمدن۔ لیکن چونکہ امام بخش کی اولاد ان کی عترت ہے اور وہ دس بارہ آدمی ہیں، لہذا فارغ البالی سے نہیں گزرتی — ضعف پیری نے بہت گھیر لیا ہے۔ عشرہ ثامنہ کے آخر میں ہیں — خدا سلامت رکھے بہت غنیمت ہیں۔"

وفات | عمر کے آخری بارہ سال عسرت و افلاس میں بسر کئے لیکن راضی بہ رضائے الٰہی رہے۔ دو سال فالج کے مرض میں مبتلا رہ کر اکیاسی سال کی عمر میں بروز پنجشنبہ ۲۴ ربیع الاول ۱۲۸۵ھ (۱۵ جولائی ۱۸۶۸ء) وفات پائی۔ اور "چراغ دہلی" کی درگاہ میں دفن ہوئے۔ مرزا غالب کے ایک خط سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ ۱۱ دسمبر ۱۸۶۲ء کو حضرت مفتی صاحب پر فالج کا حملہ ہوا تھا۔

شمس الشعراء مولوی ظہور علی نے تاریخ وفات کہی :

چہ مولانائے صدر الدین کہ در عصر　　امام اعظم آخر زمان بود

زہے صدر الصدور نیک محضر　　بعدل و داد چوں نوشیرواں بود
بروز پنجشنبہ کرد رحلت　　کہ ایں عالم نہ جائے جاوداں بود
ربیع الاوّل و بست و چہارم　　وداعِ اُو سوئے دار الجناں بود
ظہور افسوس آں استاذی ذی قدر　　پدر دارم ہمیشہ مہرباں بود
چراغش ہست تاریخِ ولادت　　کنوں گفتم "چراغِ دو جہاں بود"
۱۲۰۴ھ　　۱۲۸۵ھ

لالہ سری رام مؤلف خم خانۂ جاوید نے تاریخِ وفات کا مادہ "چراغِ امم" لکھا ہے۔
۱۲۸۵ھ

خدماتِ دینیہ | دورانِ ملازمت میں جامع مسجد دہلی کے مدرسہ "دار البقاء" کا ازسرِ نو اجرا کیا۔ یہ مدرسہ عہدِ شاہجہانی کی یادگار تھا۔ لیکن مرورِ زمانہ کے ساتھ ساتھ اپنی رونق کھو بیٹھا۔ مفتی صاحب کی علم دوستی کام آئی۔ انہوں نے طلباء کے طعام اور لباس کا انتظام اپنے ذمہ لیا اور "دین کے سوتے" کو ازسرِ نو جاری کر دیا۔ یہاں بیسیوں علماء نے ان سے استفادہ کیا۔

تالیفات | کثرتِ درس کی وجہ سے تالیف کی طرف بہت کم توجہ رہی۔ پھر بھی مندرجہ ذیل کتب تالیف کیں۔ ان میں سے بھی بیشتر تحریریں ہنگامہ آزادی کی نذر ہو گئیں۔

۱۔ رسالہ منتہی المقال فی شرح لاتشد الرحال
۲۔ در المنضود فی مرأت المفقود
۳۔ مجموعہ فتاویٰ (مختلف فتاوی کے جوابات)
۴۔ تذکرہ شعرائے اردو۔ مصطفیٰ خان شیفتہ نے ان کے تذکرے کا ذکر کیا ہے۔ جو ناپید ہے۔
۵۔ شرح متنبی (ناپید ہے) مولانا آزاد اپنے والد مولوی خیر الدین سے نقل کرتے ہیں کہ "ادب عربی کا ذوق ان سے بڑھ کر میں نے کسی فاضل میں نہیں پایا۔ حماسہ کے سینکڑوں اشعار نوکِ زبان تھے۔ متنبی کا درس سب سے پہلے انہوں نے ہی دینا شروع کیا۔ ورنہ اس کا کلام درس کی چیزوں میں داخل نہ تھا۔ انہوں نے متنبی کی ایک شرح بھی لکھی ہے۔

اولاد | مفتی صاحب کی صلبی اولاد نہیں تھی اپنی بیوی کے حقیقی بھانجے مولوی عنایت الرحمٰن کو متبنّیٰ کر لیا تھا۔

تلامذہ | مفتی صدرالدین آزردہ سے بے شمار علماء نے استفادہ کیا۔ ان کا احاطہ مقصود نہیں ہے۔ صرف نامور شاگردوں کے نام لکھنے پر اکتفا کرتا ہوں۔

۱۔ مولانا رشید احمد گنگوہیؒ (تذکرۃ الرشید ج ۱ ص ۳۱)
۲۔ مولانا محمد قاسم نانوتویؒ (سوانح محمد احسن نانوتوی ص۳۱)
۳۔ مولانا محمد منیر نانوتویؒ (" " " ص۱۵۷)
۴۔ نواب صدیق حسن خانؒ قنوجی (غالب ص۲۸۶)
۵۔ مولوی خیرالدین (والد مولانا آزاد) (" ص۲۸۲)
۶۔ نواب یوسف علی خان والیٔ رامپور (تاریخ ادب اردو۔ ص۴۰۵)
۷۔ سرسید احمد خان (" " " ص۴۰۵)
۸۔ مولوی ذوالفقار علی (گل رعنا۔ ص۳۳۲)
۹۔ مولوی فیض الحسن (" ۔ ص۳۳۲)
۱۰۔ مولوی سمیع اللہ سی۔ جی۔ ایم (" ۔ ص۳۳۲)
۱۱۔ مفتی سعد اللہ مراد آبادی (تذکرہ علمائے ہند ص۲۱۴)
۱۲۔ محمد جمیل برہان پوری (" " " ص۴۲۳)
۱۳۔ مولوی امیر حسن سہسوانی (" " " ص۵۶۳)
۱۴۔ مولوی کریم الدین پانی پتی مؤلف تذکرہ شعرائے ہند (تذکرہ شعرائے ہند)
۱۵۔ مولانا محمد مظہر نانوتویؒ (تذکرہ مشائخ دیوبند ص۱۶۳)
۱۶۔ شیخ ضیاالدین ایل۔ ایل۔ ڈی (محمد احسن نانوتوی۔ ص۱۸۴)
۱۷۔ مولوی ظہور علی (شمس الشعراء) (تذکرہ علمائے ہند در بیان آزردہ)

٭ ٭ ٭

ذوقِ سخن | مفتی صاحب اعلیٰ درجے کے شاعر بھی تھے۔ عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں مشقِ سخن کرتے تھے۔ اردو میں اوائل میں شاہ نصیر سے اصلاح لیتے تھے کچھ عرصے بعد میاں مجرم اکبرآبادی اور آخر میں میر ممنون سے مشورہ لیتے تھے۔

اردو میں ان کا کلام نہایت صاف وسلیس اور پُر اثر ہے۔ مگر کبھی دیوان کی صورت میں شائع نہیں ہوا۔ کچھ تو اس میں سے ہنگامہ آزادی میں ضائع ہوگیا۔ اور باقی تذکروں میں منتشر پڑا

ہے. تبرکاً دو چار اشعار درج کئے جاتے ہیں :

دامن اس کا تو بہت دور ہے اے دستِ جنوں
کیوں ہے بیکار گریباں تو مرا دور نہیں

٭

کامل اس فرقہ زہاد سے اٹھا نہ کوئی
کچھ ہوئے تو یہی رندانِ قدح خوار ہوئے

٭

آزردہ مر کے کوچہ جاناں میں رہ گیا
دی تھی دعا کسی نے کہ جنت میں گھر ملے

٭

میں اور ذوقِ بادہ کشی لے گئیں مجھے
یہ کم نگاہیاں تیری بزم شراب میں

٭

اچھا ہوا نکل گئی آہِ حزیں کے ساتھ
اک قہر تھی، بلا تھی، قیامت تھی، جاں نہیں

سر سید احمد خاں نے "آثار الصنادید" میں تینوں زبانوں میں نمونۂ کلام درج کیا ہے۔

پسماندگی اور افلاس کا اس مہلک اثر کے ساتھ کوئی مقابلہ ہی نہیں ہو سکتا جو مغربی طرزِ تعلیم کی اندھی تقلید کے ہاتھوں دنیائے اسلام کے مذہبی مسلمات پر پڑے گا۔ اگر ہم اسلام کی صداقت کو ایک ثقافتی عامل کی حیثیت سے محفوظ و مصئون رکھنا چاہتے ہیں، تو ہمیں مغرب کے ذہنی ماحول سے ہر وقت اور ہر آن چوکنا رہنا ہوگا جو ہمارے معاشرہ اور ہمارے رجحانات پر غالب و مستولی ہونے والا ہے۔ مغربی زندگی کے طور طریق اور وضع قطع کی تقلید کر کے مسلمان مغربی نظریۂ حیات کو اختیار کرنے پر آہستہ آہستہ مجبور ہوتے چلے جا رہے ہیں کیونکہ کسی چیز کی ظاہری تقلید کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہم رفتہ رفتہ اس چیز کے بارے میں دنیا کی رائے کو من وعن قبول کرتے چلے جاتے ہیں۔

افادات حضرت علامہ شمس الحق افغانی مدظلہٗ
مرتبہ حضرت مولانا قاضی عبدالکریم صاحب کلاچی

علمی جواہر پارے

۱۔ فرمایا: ایک ہیں مقامات اور ایک ہیں حالات۔ حالات مقصود نہیں ہیں مگر مقامات مقصود ہیں۔ (حالات جیسا کہ اچھے خواب کا نظر آنا، عبادت میں لذت حاصل ہونا، رقت کا طاری ہو جانا یا انوار وغیرہ کا دیکھ لینا۔ اور مقامات جیسے مقام صبر کا حاصل ہو جانا، مقام رضا پر فائز ہونا، مقام شکر کو پا لینا وغیرہ ذالک رزقنا اللہ بفضلہ وکرمہ)

۲۔ فرمایا: واردات کے لئے ایک شرط ہے۔ قنوط عن الواردات۔ امیدوار وارادت سے واردات میں بے حد تاخیر ہوتی ہے۔ اس پر ایک صاحب کا جو غالباً حضرت ہی سے بیعت تھے کا قصہ بیان فرمایا کہ نسبت کے ظہور کے متمنی تھے، اور مدت تک اس کا ظہور نہیں ہوا ایک دفعہ ایک مجلس میں بیٹھے تھے جس میں اکثر حکام اور داڑھی منڈھے وغیرہ تھے۔ میں نے دیکھا تو ان کی حالت بہت بہتر معلوم ہوئی۔ مجلس کے بعد میں نے پوچھا مولوی صاحب آج کیا بات ہے؟ اس نے جواب میں نہایت فرحت کے ساتھ کہا الحمدللہ اس مجلس میں وہ نسبت حاصل ہو گئی، جس کی مدت سے تمنا تھی۔ میں نے کہا: یہ اس لئے کہ ایسی مجلس میں آپ کو ایسی حالت حاصل ہونے کی امید نہیں تھی۔

(اس تنبیہ میں جہاں حضرت مدظلہٗ نے اس کو یہ تلا دیا کہ واردات اور حالات کے حاصل ہونے کیلئے قنوط عن الواردات ضروری ہے، وہاں یہ بھی اشارہ فرما دیا کہ یہ برکت فساق و فجار فسق و فجور کی نہیں، کہیں غلط فہمی نہ ہو جاوے بلکہ واردات سے صرف نظر اور نظر الی المقصود وا

نیکی کا فیضان ہے ـــــ یہ بھی معلوم ہوا کہ بزرگان دیوبند کو اللہ تعالیٰ نے جہاں دولت استقامت سے نوازا ہے جو کہ اصلی مقصود اور اعلیٰ نعمت ہے وہیں یہ حضرات نعمت کشف وکرامت سے بھی نوازے گئے ہیں۔ کیونکہ حضرت مدظلہٗ کو اسکی اچھی حالت کشفاً معلوم ہوئی۔ ع

یار ما ایں دارد و آں نیز ہم

میں کہتا ہوں اگر کسی بدعتی کی مجلس میں بھی کوئی اچھی حالت وارد ہو تو اس کو بھی اسی پر قیاس کیا جاوے کہ وہ بدعتی کے بدعت کی برکت نہیں بلکہ کسی اور نیکی کا اثر ہے، جس کی طرف توجہ نہیں ہے۔

۳۔ فرمایا: ہر علم کا ایک ہوتا ہے مبداء، ایک ہوتا ہے وسط، اور ایک انتہاء۔ عمرانیات جس میں سائنس وغیرہ بھی داخل ہیں، کا مبداء تو ہے مادیات، وسط ہے ان میں تفکر اور ان سے استفادہ بالنظر وغیرہ۔ ارشاد خداوندی ویتفکرون فی خلق السموات والارض۔ میں ان دونوں کا ذکر ہے۔ لیکن منتہیٰ اور غایت اس کی ہے وصول الی معرفۃ خالق المادیات۔ اس کی طرف ارشاد ذیل میں راہنمائی فرمائی گئی ہے کہ ربنا ما خلقت ھذا باطلا سبحانک فقنا عذاب النار۔ فرمایا پہلے جملہ سبحانک میں عظمت الٰہیہ اور دوسرے جملہ فقنا۔ الخ میں خشیۃ ربانیہ کا ذکر ہے۔

۴۔ فرمایا، پہلے لوگوں کے علوم مادیہ بہ نسبت آج کے سطحی ہوتے تھے، مگر غرض وغایت کے لحاظ سے بہت بہتر اور گہرے، کیونکہ ان سے وصول الی الخالق ہو جاتا تھا۔ بدوی کا علم البعرہ بھی موصل الی الغایۃ ہو گیا۔ اور آج کے علوم گہرے عمیق اور طویل وعریض تو ہیں مگر بے معنی، اس ضمن میں فرمایا: یورپ کے بدمعاشوں نے کائنات کو چھان مارا مگر خدا تک نہ پہنچ سکے۔

۵۔ فرمایا: (متقدمین میں سے کسی مشہور حکیم کا نام لیکر) کہ وہ منکر معاد تھا۔ ایک دن کسی زبردست اور ظالم نے اس کو کئی ڈنڈے رسید کئے۔ یہ انتظار میں رہا کہ قدرت اس سے انتقام لے گی۔ روزمرہ پوچھتا تھا کہ اس کا کیا ہوا معلوم ہوا کہ مرنے تک اس کو اس ظلم پر کوئی سزا نہیں ملی۔ تو کہا: علمت ان وراء ھذا العالم عالم آخر۔ معلوم ہوا کہ اس جہان کے بعد کوئی اور جہان ہے جس میں انسان سے اپنے اعمال کا بدلہ لیا جاوے گا۔

۶۔ فرمایا: رات کو غیب سے مناسبت ہے، اور لطائف عالم غیب (عالم امر) سے ہیں۔ اس لئے رات کو ان اوراد کا اثر زیادہ ہو گا۔ ایک اور مجلس میں اسی سلسلہ میں فرمایا کہ جو حضرات دن کو بھی شغل لطائف فرماتے ہیں تو مصنوعی رات بنا لیتے ہیں، یعنی اکیلے بیٹھ کر دروازہ بند کر کے آنکھیں بند کریں اور اوپر کپڑا بھی ڈال دیا تاکہ جتنا بھی ہو سکے اندھیرا کر لیں تاکہ مصنوعی سی رات بن جاوے۔ اس

(باقی صفحہ پر)

مولانا ظفر احمد عثمانی شیخ الحدیث دار العلوم اسلامیہ
ٹنڈو الٰہیار

اسلام اور سائنس

دسویں سالانہ سائنس کانفرنس ۱۹۶۸ء
بی ای ایچ ایس۔ ایجوکیشن فاؤنڈیشن کالج کراچی
میں پڑھا گیا۔

بعد الحمد و الصلوٰۃ۔ آج کل بعض یورپین حضرات اور ان کے ہمنواؤں کا یہ خیال ہے کہ اسلام اور سائنس میں تضاد ہے حالانکہ اہل انصاف محققین یورپ اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ جس وقت یورپ وحشت اور بربریت کا شکار تھا اسوقت قرطبہ اور بغداد سائنس میں عروج پر تھا رصدگاہیں قائم کی جارہی تھیں، طبعیات و فلکیات میں مسلمان ترقی کر رہے تھے ریاضی اور ہیئت میں نئی صورتیں پیدا کی جارہی تھیں۔ الجبرا مسلمانوں کی ایجاد ہے۔ ہوائی جہاز بھی غبارہ کی شکل میں مسلمانوں نے ایجاد کیا، شمسی مہینوں کو موسم کے ساتھ موافقت دینا کسی مہینہ کو ۲۸ دن کبھی ۲۹ دن کا قرار دینا اور اس طرح شمسی مہینوں کو موسم کے مطابق کر دینا مسلمانوں ہی کا کام تھا۔ گھڑی گھنٹہ مسلمانوں نے ایجاد کیا۔ خلیفہ ہارون الرشید کا گھنٹہ اب تک پیرس میں موجود ہے جو خلیفہ اسلام نے شاہ فرانس کو بطور تحفہ بھیجا تھا۔ خلیفہ ہارون الرشید کے باغ میں سونے کی چڑیاں درختوں پر بٹھلائی گئی تھیں، جب خلیفہ باغ میں تشریف لاتے بٹن دبانے سے سب چڑیوں کے منہ سے: ادخلوھا بسلام آمنین۔ کی آواز نکلتی تھی۔ گویا ریڈیو بھی مسلمانوں کی ایجاد ہے۔ بندوق سب سے پہلے سلطان بابر کے ہاتھ میں دیکھی گئی، قلعہ شکن توپوں کی نظیر منجنیق مسلمانوں نے ایجاد کی تھی۔ ڈاک کا انتظام بھی اسوقت سے اچھا تھا۔ حجاج بن یوسف نے تین دن میں ایک منجنیق جس کا نام عروس تھا کوفہ سے کراچی پہنچا دی تھی۔ گھوڑوں کی ڈاک سے وہ کام لیا گیا جو آجکل ریلوں سے بھی نہیں ہو سکتا۔ کبوتروں کی ڈاک اس سے بھی زیادہ تیز رفتار تھی۔ غرض جس زمانہ میں یورپ سائنس دانوں کو سولی پر چڑھا رہا تھا یا آگ میں جلا رہا تھا۔ اس وقت مسلمان سائنس میں برابر ترقی کر رہے تھے بحری جہاز

کو اس وقت آج سے بہتر نہ سہی مگر یہ واقعہ ہے کہ مسلمانوں نے ان ہی جہازوں سے تمام دنیا کو روند ڈالا تھا وہ وہاں پہنچے جہاں اب تک یورپ کے بحری جہاز نہیں پہنچ سکے۔ ابن بقلون حد سکندری تک پہنچ گیا جس کا اب تک اہل یورپ کو پتہ نہیں چلا۔ امریکہ کی دریافت کا سہرا بھی عربوں کے سر ہے، کولمبس سے پہلے امریکہ پہنچ گئے تھے۔ یورپین نومسلم خالد شیلڈرک نے رنگون میں اپنی ایک تقریر میں یہ واقعہ بیان کیا تھا کہ جب کولمبس کا جہاز امریکہ پہنچا ہے تو وہاں ایک بستی میں عرب آباد تھے، جو عربی بولتے تھے، یورپ نے اس حقیقت پر پردہ ڈال کر کولمبس کے سر پہ امریکہ کی دریافت کا سہرا باندھ دیا۔ کیمیا اور طب میں مسلمانوں کی معلومات اور ایجادات سے یورپ نے سبق لیا۔ ریاضی ہندسہ حساب میں بھی ان کی رہنمائی کے محتاج ہوئے، چنانچہ ان علوم کی بعض اصطلاحات اب تک عربی ہی میں بیان کی جاتی ہیں۔

قرآن کریم میں ارشاد ہے: افلم ینظروا فی ملکوت السموات والارض وما خلق اللہ من شئ۔ کیا یہ لوگ آسمانوں اور زمینوں کی مملکت میں غور نہیں کرتے اور اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے اس کو نہیں دیکھتے۔ قرآن پاک میں ملکوت السموات والارض۔ میں غور کرنے کی بار بار تاکید ہے۔ اور اس کا بھی کہ ہم نے سلیمان علیہ السلام کے لئے ہوا کو مسخر کر دیا تھا۔ غدوھا شھر ورواحھا شھر جو ان کو ایک مہینہ کی مسافت پر صبح کو اور ایک ماہ کی مسافت پر شام کو لے جاتی اور پہنچاتی تھی۔

داؤد علیہ السلام کے لئے پہاڑوں اور پرندوں کو مسخر کر دیا تھا کہ ان کے ساتھ تسبیح پڑھیں۔ اللہ تعالیٰ نے انبیاء کے لئے آج سے اچھا ہوائی جہاز اور آج سے اچھا ریڈیو دیا تھا۔ سیدنا محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے براق کو مسخر کر دیا کہ مکہ سے شام اور وہاں سے آسمانوں پر عرش تک سیر کرائے۔ سبحن الذی اسری بعبدہ لیلا من المسجد الحرام الی المسجد الاقصی الذی بارکنا حولہ لنریہ من آیتنا انہ ھو السمیع البصیر۔ ولقد رآہ نزلۃ اخری عند سدرۃ المنتھی اذ یغشی السدرۃ ما یغشی لقد رأی من آیات ربہ الکبری۔ ہمارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اسی فضا سے زمین و آسمان کے درمیان ہیں بہت آگے تشریف لے گئے ہیں، جہاں تک سائنس والے کبھی نہیں پہنچ سکتے، ابھی تک تو چاند پر بھی نہیں پہنچے۔

الغرض اسلام سائنس کا مخالف نہیں بلکہ ملکوت سموات والارض۔ میں فکر کرنے اور غور

کرنے کی دعوت دیتا ہے، اسلام سائنسی مشاہدات کا مخالف نہیں ہے البتہ سائنس دانوں کے ان نظریات کا مخالف ہے جو اپنی عقل سے پیدا کرتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ دنیا کا دار و مدار نظام شمسی پر ہے اور نظام شمسی خود ہی چل رہا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کا بنایا ہوا نہیں یا جملہ اجسام کی بنیاد مادہ اور صورت یا اجزا دیمقراطیسی پر ہے اور یہ قدیم نہیں، خدا کے بنائے ہوئے نہیں۔ ظاہر ہے کہ ان نظریات کی بنیاد مشاہدہ پر نہیں بلکہ اپنی عقل و فہم پر ہے۔

اسلام سائنس کی تائید اسی درجہ میں کرتا ہے کہ اس سے خاص کائنات کی حکمت و عظمت علم و قدرت اور وحدت کا سبق لیا جائے انبیاء علیہ السلام کے لئے ہوا یا براق کو اسی لئے مسخر کیا گیا تھا، کہ وہ اللہ کی قدرت کی نشانیاں دیکھیں۔ اور مخلوق کو اس سے آگاہ کریں۔ اگر سائنس سے یہ کام لیا جائے اور طبیعیات و فلکیات کے مشاہدوں سے اپنی اقتصادیات اور فوجی طاقت میں ترقی کی جائے، تو اسلام اس سے نہیں روکتا، البتہ سائنس دانوں کے من گھڑت نظریات پر یقین کرنے سے ضرور روکتا ہے۔ کیونکہ اس کا مدار انکی اپنی عقل و فہم پر ہے، مشاہدہ پر نہیں۔ اس لئے ان سب چیزوں کو ثانوی درجہ پر رکھتا ہے۔ اول درجہ میں عقائد، عبادات و اخلاق روحانیات کو قرار دیتا ہے کہ انسانیت کی ترقی اسی سے ہے۔ آپ ہوا میں اڑنے لگے تو پرندے آپ سے زیادہ اس میں کامیاب ہیں۔ پانی پر چلنے لگے تو سمندری جانور اس میں آپ سے زیادہ ماہر ہیں۔ انسانیت کا کمال یہ ہے کہ اس کو عقائد و عبادات و اخلاقیات اور روحانیات کا صحیح علم حاصل ہو۔ ورنہ اور جتنے کام ہیں ان میں جانور انسان سے کم نہیں بلکہ دس قدم آگے ہی نظر آئیں گے۔ اس سائنسدان کی عقل پر افسوس ہے جو دنیا بھر کے حالات سے واقف ہے مگر خود اپنے سے واقف نہیں اگر وہ اپنے اندر غور کرتا تو نظر آتا کہ ان چاند سورج ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں۔ جو اس کو اپنی روح اور قلب کی گہرائیوں میں نظر آئیں گے ۔۔

آسمان ہاست در ولایت جان کار فرمائے آسمان جہان
غیب را ابرو آبے دیگر است آسمانے آفتابے دیگر است

اگر انسان اپنے سے واقف ہو جائے اور اپنے اندر نظر کرنے لگے تو اللہ تعالیٰ کی معرفت سے سرفراز ہو جائے اور اس کے بعد دنیا بھر کی عجائبات پر نظر کرنے سے مستغنی ہو جائے۔

★

ادبیات

سعادتِ حج بیت اللہ

حق نواز خالد
۶۱۵ - ڈسکہ کوٹ - سیالکوٹ

★

مچلتی ہے جبیں جس در پہ جھکنے کو وہی در ہے
جہاں کے بتکدے میں جو خدا کا اولیں گھر ہے

عطا کر دی تڑپ اللہ نے اس در پہ جانے کی
بسا دی آرزو دل میں مقدر آزمانے کی

تمنا تھی ادائے فرض کا ارماں نکل پائے
کہ بیت اللہ میں پہنچیں تو دل کو کچھ قرار آئے

خبر کیا کیسے گزرے آرزوئے دید کے لمحے
وہ دلخوش کن مسرت بار وہ امید کے لمحے

تھے جس کے منتظر وہ ساعتِ مسعود آ پہنچی
وہ ساعت کہ رضائے خالق و معبود آ پہنچی

دیارِ پاک کا عزمِ سفر اور حق کے دیوانے
چلے تھے حسن گاہِ شمع کی جانب یہ پروانے

مبارک ہو طوافِ خانہ کعبہ کا شرف پایا
کہ ذکرِ ربنا لبیک ہر سو ہر طرف پایا

سعادت حجرِ اسود چومنے کی تھی مقدر میں
سعی لکھی تھی مروہ و صفا کی بختِ یاور میں

ادا کر کے فریضہ حج کا رختِ سفر باندھا
تصور میں بسا تھا حاجیوں کے گنبدِ خضرا

وہ روضۂ مقدس رحمتیں جس پر برستی ہیں
کہ جس کی دید کو عشاق کی نظریں ترستی ہیں

ادب گاہِ جہاں کا رو برو جب وہ مقام آیا
عقیدت سے لبوں پر الصلوٰۃ والسلام آیا

جھکی نظریں ادب سے اشک بہہ نکلے مسرت کے
کہ ساری زیست سے افضل تھے وہ لمحے سعادت کے

شفیع المذنبیں ﷺ سے کیں نیاز و راز کی باتیں
دلِ بیتاب نے کیں اُن ﷺ سے سوز و ساز کی باتیں

اجازت واپسی کی لی سراپا انکساری سے
جدا ہونا پڑا آخر درِ محبوب باری سے

دیارِ پاک کی یادیں بھلا کیسے بھلائیں گے
وہ فرحت خیز نظارے ہمیشہ یاد آئیں گے

★

مولانا سلطان محمود ناظم دفتر

احوال وکوائف دار العلوم

حضرت مہتمم صاحب کا سفر مشرقی پاکستان | جنوری ۱۹۶۹ء کے پہلے ہفتہ میں ڈھاکہ میں جمعیۃ العلماء اسلام مشرقی پاکستان کا عظیم الشان اجتماع ہوا اس اجتماع اور جمعیۃ کے مرکزی کونسل کی میٹنگوں میں شمولیت کیلئے مشرقی پاکستان کے جمعیۃ العلماء اور وہاں کے چند سرکردہ حضرات کی خواہش اور دعوت پر حضرت شیخ الحدیث مولانا عبد الحق مدظلہ ۲ جنوری کو ڈھاکہ تشریف لے گئے۔ مدیر ماہنامہ الحق مولانا سمیع الحق بھی ان کے ہمراہ تھے۔ ۲ر جنوری کو روانگی سے قبل آپ نے لاہور کے میو ہسپتال میں حضرت مولانا عبید اللہ انور مدظلہ کی عیادت کی اور راہ حق میں ابتلاء اور استقامت پر انہیں مبارکباد پیش کی۔ ۱۰ بجے آپ حضرت مولانا درخواستی مدظلہ مولانا مفتی محمود صاحب، حضرت مولانا محمد یوسف بنوری، مولانا خان محمد صاحب کندیاں اور دیگر زعماء جمعیت کے ساتھ ڈھاکہ روانہ ہوئے، ڈھاکہ ایرپورٹ پر وہاں کے جمعیۃ العلماء اور دیندار مسلمانوں نے کثیر تعداد میں اکابر جمعیۃ کا پرجوش استقبال کیا۔ ۴ر جنوری کو ایڈن ہوٹل کے وسیع لان میں جمعیۃ کا عمومی اجلاس شروع ہوا، پہلی نشست کی صدارت حضرت شیخ الحدیث مدظلہ نے فرمائی اور اختتام اجلاس میں صدارتی خطاب فرمایا۔ اس دوران آپ نے جمعیۃ کی مجلس شوریٰ کے اجلاس میں بھی شمولیت فرمائی۔ ۵ر جنوری کو بعد از مغرب آپ نے جمعیۃ کے اختتامی اجلاس میں بھی مفصل خطاب فرمایا۔ جس میں آپ نے اسلامی آئین کے بارہ میں صدر مملکت کے تازہ بیان کا خاص طور پر جائزہ لیا۔ اور اسلامی آئین کے نفاذ کے بارہ میں شبہات اور رکاوٹوں کا مدلل طور پر جواب دیا۔ ۶ر جنوری کو جمعیۃ کی کارروائی ختم ہوئی۔ مگر وہاں کے کئی احباب کی خواہش پر آپ ۱۱ر جنوری تک ڈھاکہ میں ٹھہرے۔ اس اثناء جناب خواجہ مولانا انیس اللہ صاحب اور ان کے خاندان کے دیگر حضرات جناب خواجہ عبد الرحمان صاحب، جناب حاجی بشیر الدین صاحب بوگرہ، جناب مصطفیٰ احسن صاحب مدیر پاسبان جناب مجتبیٰ احسن صاحب، جناب ایس اے کبیر صاحب، جناب خواجہ خیر الدین صاحب ایم این اے اور دیگر حضرات کے ہاں خصوصی مجالس میں شرکت کی اور حاضرین کو اپنے گرانقدر نصائح سے نوازا۔ پچھلے سال کی طرح اس دفعہ بھی ان حضرات کے علاوہ جناب مولانا محی الدین صاحب اور مقامی جمعیۃ العلماء اسلام کے اکابر حضرات بالخصوص نواب باڑی کی خواجہ برادری نے حضرت شیخ الحدیث کی ضیافت اور خاطر داری میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اس دوران آپ نے ٹونگی میں منعقد ہونے والے

عظیم الشان تبلیغی اجتماع میں بھی شمولیت فرمائی۔ نیز مدرسہ امداد العلوم فرید آباد کے تعلیمی سال کا افتتاح بھی درسِ قرآن مجید سے فرمایا۔ ۱۱ر جنوری کی ظہر کو آپ ڈھاکہ سے روانہ ہوئے اور اسی دن لاہور اور پشاور ہوتے ہوئے رات کو بخیر و عافیت دار العلوم حقانیہ پہنچے۔

تعلیمی سال کا آغاز ۱۰ر شوال کو دار العلوم حقانیہ کے نئے تعلیمی سال کا داخلہ شروع ہوا۔ ۲۲ر شوال کو دار الحدیث میں ترمذی شریف کے درس اور ختم کلام پاک سے نئے تعلیمی سال کا افتتاح ہوا۔ حضرت شیخ الحدیث نے علم کی فضیلت اور طلبہ علوم نبویہ کے فرائض اور مقاصد پر مفصل خطاب فرمایا جو اسی پرچہ میں شریکِ اشاعت ہے، اس وقت دار العلوم کے تمام شعبے بحمداللہ ترقی کے مراحل طے کرتے ہوئے مصروفِ کار ہیں اور اسباق باقاعدہ جاری ہیں۔ ملک و بیرون ملک سے طلبہ کثیر تعداد میں پہنچ گئے ہیں۔ دورۂ حدیث کے طلبہ بھی حسب سابق ایک سو سے متجاوز ہو چکے ہیں۔ نیز دار العلوم کا شعبہ اطفال (مڈل اسکول) بھی بلا کسی تعطل کے مصروفِ تعلیم ہے۔

پشتو ٹولنہ کا علمی عطیہ کابل کے ممتاز علمی اور ادبی ادارہ "پشتو ٹولنہ" نے ماہنامہ الحق اور دار العلوم حقانیہ کی لائبریری کے لئے اپنی شائع کردہ ممتاز کتاب علامہ سید سلیمان ندوی کی ضخیم کتاب سیرۃ النبی کا پشتو ترجمہ اور دیگر مطبوعات کا سیٹ ارسال فرمایا ہے اور حضرت شیخ الحدیث کے نام ایک مکتوب میں دار العلوم سے علمی اور دینی روابط کے قیام کی خواہش اور اس پر فخر و مسرت کا اظہار فرمایا ہے۔ جوابی تشکر نامہ میں حضرت شیخ الحدیث نے بھی اس قسم کے جذبات کا اظہار فرمایا اور اس علمی تعلق اور روابط کو دونوں اداروں کے لئے باعثِ خیر و برکت قرار دیا۔

شیخ الحدیث غورغشتیؒ کی تعزیت حضرت شیخ الحدیث مولانا نصیر الدین غورغشتی قدس سرہٗ کی عظیم دینی شخصیت، بلند مرتبہ حیثیت اور دار العلوم حقانیہ کے ساتھ دیرینہ تعلق اور خاص شفقت کی بنا پر ان کی وفات کی اطلاع دار العلوم میں صاعقہ بن کر گری، وفات سے ایک روز قبل جب علالت کی اطلاع پہنچی تو اساتذہ وعملہ کی ایک جماعت حضرت شیخ الحدیث مدظلہٗ کی معیت میں واہ کے فوجی ہسپتال پہنچی دوسرے دن وفات کی اطلاع پہنچتے ہی دار العلوم میں تعطیل کر دی گئی اور دار العلوم کے اساتذہ اور تقریباً تمام طلباء حضرت مرحوم کی آخری رسومات میں شرکت کیلئے غورغشتی روانہ ہوئے، نمازِ جنازہ کے بعد حضرت مہتمم دار العلوم حقانیہ نے شیخ وقت محدث جلیل مولانا مرحوم کے مناقب اور کمالات پر طویل خطاب فرمایا اور ان کے وصال کو علمی و دینی حلقوں کا ایک سرچشمہ ہدایت اور بہت بڑے فیض و برکت سے محرومی کا سبب قرار دیا۔ دار العلوم میں حضرت مرحوم کیلئے ختم کلام پاک اور ایصالِ ثواب کا سلسلہ دو تین دن تک جاری رہا۔۔۔۔۔۔